تلمیحاتِ فیض
ظہیر علی

تلمیحاتِ فیض

ظہیر علی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

نام کتاب : تلمیحاتِ فیض
مصنف : پروفیسر ظہیر علی
بارِ اوّل : اپریل ۲۰۰۱ء
تعداد : ایک ہزار
صفحات : ۱۷۶
سرِ ورق : سیّدہ فردوس قادری
کمپوزنگ : جاوید یوسف، غزال ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس، فون: 3495 266
مطبع : ادبی پرنٹنگ پریس، ممبئی
قیمت : ۱۵۰؍روپے
ناشر : انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲۔دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۱
ملنے کا پتہ : انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،
۹۲۔دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۱

TALMIHAT-E-FAIZ
By Prof. Zaheer Ali
First Edition : April 2001
Price : 150/-

Available at :
Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute
92-Dadabhoy Nawroji Road,
Opp. C.S.T., Mumbai 400 001

(یہ کتاب مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادیمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی)

والدِ محترم

سیّد محسن علی (مرحوم) کے نام

دل و دماغ میں روشن سخن کے باب ہوئے
کلامِ فیضؔ جو دیکھا تو فیضیاب ہوئے

مندرجات

تعارف

دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں تلمیحات کا استعمال ہوتا رہا ہے اور قدیم و جدید عربی میں تلمیحات کے استعمال کو ادبی ہنر قرار دیا گیا ہے۔ تلمیح کے سلسلے میں ایک عرصے سے یہ بحث بھی ہوتی رہی ہے کہ یہ صنعت ہے بھی یا نہیں۔ تقریباً سو سال پہلے مرحوم نجم الغنی رامپوری نے اپنی تالیف ''بحرالفصاحت'' میں تلمیح کو صنعت قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''تلمیح کسی چیز کی طرف نظر کرنے کو کہتے ہیں پس یہ معنی خاص ہیں۔ یہ صنعت اس طرح ہے کہ شاعر اپنے کلام میں کسی مسلۂ مشہورہ یا کسی قصے یا مثل شائع یا اصطلاح نجوم وغیرہ کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرتے جس کی تعبیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔'' مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بھی اسی قول سے مطابقت رکھتی ہوئی بات کہی ہے کہ ''تلمیح کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہیں اور فنی مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اختصار کے ساتھ حسن یا زور پیدا کرنے کے لئے کسی قصے، شعر یا کہاوت کی طرف اشارہ کیا جائے۔''

ہر زبان دنیا کے کسی نہ کسی خطے کے مکینوں کے اقوال و افعال اور تاریخ و تہذیب کی آئینہ داری کرتی ہے اس لئے ہر چھوٹی اور بڑی زبان میں تلمیحات کا کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ تلمیحات کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سمندر کو کوزہ میں سمیٹتے ہیں اور اختصار میں تفصیل و تشریح کی ایک دنیا رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ایک وقت تھا جب داستان اور مثنوی جیسی ضخیم و طویل اصناف ادب میں بھی تلمیحات کا استعمال اظہارِ فن اور زورِ بیان کے لئے کیا جاتا تھا لیکن اب معاشرے کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اختصار و ایجاز کو ترجیح حاصل ہوتی جارہی ہے اور اس لحاظ سے تلمیحات کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

''تلمیحاتِ فیض'' اردو اور انگریزی کے مستند اور مقبول ادیب پروفیسر ظہیر علی کی تصنیف ہے جس میں موصوف نے کلیاتِ فیض میں استعمال ہونے والی تلمیحات کی دقت نظری سے تشریح و توضیح کی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں تلمیحات کا استعمال بہت کم ہوتا ہے لیکن کلام فیض میں صورت حال دیگر ہے۔ فیض عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے کماحقہٗ واقف تھے اور ان کا

مطالعہ وسیع تھا اس لئے ان کے اشعار میں ایسی تلمیحات کا تصرف ہونا ناگزیر تھا جس کے پس منظر میں اہم سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیاں اور واقعات موجود ہیں۔ اردو ادب میں غالب اور اقبال کے بعد فیض کو سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ کلام فیض کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص مبلغ علم اور تجربات و مشاہدات کا وہ اثاثہ رکھتا ہو جس کے پس منظر میں وہ تلمیحات فیض کو آسانی سے سمجھ سکے اور اُن سے لطف اندوز ہو۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ایک تلمیح مختلف صورتوں اور رنگوں میں استعمال ہوتی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے بھی مطالعے کی وسعت اور فکر وفن کی نزاکتوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ انہی تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر ظہیر علی نے ایک معتبر اور مفید کام کیا ہے۔

پروفیسر ظہیر علی نے کلامِ فیض میں مستعمل اشعار اور شعراء کے تعلق سے بھی سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بادی النظر میں بعض قارئین کو ان کا یہ طریقہ کار خلاف معمول محسوس ہو لیکن اس تصنیف کے بنیادی مقصد کے پیش نظر، ان کی یہ فراخدلی، بامعنی، پرلطف اور مفید ہے۔

پروفیسر موصوف انگریزی اور اردو زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور "تلمیحاتِ فیض" میں ان کا انداز نگارش سادگی اور پُرکاری کا نمونہ ہے۔ انھوں نے تلمیحاتِ فیض کو سلیس اور دل نشین انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس تصنیف کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تلاش و تجسس کے کتنے کٹھن مراحل طے کئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "تلمیحاتِ فیض"، فیض شناسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی اور فیض کا مطالعہ کرنے والوں کی معلومات میں معتد بہ اضافہ ہوگا۔ پروفیسر ظہیر علی اس ادبی مہم کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

آدم شیخ

اعزازی ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ممبئی

پیش نوشت

تلمیح کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف نظر کرنا ہے۔ ادبی اصطلاح یا علم بیان کی اصطلاح میں تلمیح ایک ایسی صنعت کا نام ہے جس کے ذریعہ شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات میں کسی مشہور قصّے، کہانی یا داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی حافظے کا حصہ ہو۔ میں نے تلمیحاتِ فیض کی توضیح وتشریح میں اسے ہر دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ انگریزی میں تلمیح کا ہم معنی لفظ allusion ہے۔ عام طور سے تلمیح کو صنائع بدائع یا Figures of Speech کی صنعتوں میں شمار نہیں کیا جاتا جیسا استعارہ، تشبیہ، مبالغہ، تجسیم یا اجتماعِ ضدّین کو کیا جاتا ہے۔ صنائع بدائع کو سلیقے سے استعمال کرنے کے لئے ایک بات تو یقیناً ضروری ہے کہ تخلیق کار زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو لیکن ساتھ ہی یہ صلاحیت اس میں فطری طور پر ودیعت کی گئی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں موزونیٔ طبع کا بہت عمل دخل ہوتا ہے جبکہ تلمیح کے استعمال میں وسیع مطالعہ اہم کردار نبھاتا ہے۔ تلمیح کو شعر یا نثر میں نفسِ مضمون کے مطابق برتنے کا فن ایک طرح سے اکتسابی عمل ہے۔ جس تخلیق کار کا مطالعہ جتنا زیادہ وسیع اور مختلف النوع ہوگا اس کی تخلیقات میں اتنی ہی زیادہ تلمیحات استعمال ہوں گی۔ نظم یا نثر میں کسی نکتے یا کسی وصف کو خوبصورتی یا شدتِ بیان کے ساتھ پیش کرنے کے لئے تلمیح کا سہارا لیا جاتا ہے یعنی ایسے الفاظ، اسماء یا محاورے استعمال کئے جاتے ہیں جن سے کوئی واقعہ، کہانی، داستان یا قصّہ وابستہ ہو۔ تلمیح کا استعمال صراحت یا طول بیانی سے بچنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اس طرح تخلیقی نگارشات میں الفاظ کے مختصر استعمال سے زورِ بیان کے ساتھ ساتھ تہہ داری اور معنوی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں تو دنیا کی ہر زبان کے ادب میں تلمیح کا استعمال ہوتا ہے لیکن اہلِ عرب اس کے استعمال کو ادبی ہنر کا درجہ دیتے ہیں۔

اردو شعر و ادب کی پرداخت بڑی حد تک فارسی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ اس لئے ہمارے کلاسیکی سرمایے میں زیادہ تر وہی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں جو فارسی ادب میں رواج پا چکی تھیں۔ ان تلمیحات کا سرچشمہ بڑی حد تک ایرانی تاریخ، ثقافت، داستانیں اور مذہبی صحائف تھا۔ کبھی کبھار یونانی اساطیر سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا۔ اس طرح اردو شعر و ادب میں بھی انہی قصّہ طلب الفاظ و

اسماء کا استعمال ہونے لگا جو فارسی میں مقبول عام تھے۔ اس کا سبب وہی تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے یعنی ہمارے کلاسیکی تخلیق کاروں کا مطالعہ فارسی اور کسی حد تک عربی تصانیف تک محدود تھا۔ اقبال سے قبل شاید ہی کسی اردو شاعر نے یورپی تاریخ، ثقافت یا روایات کے کسی پہلو، قصہ یا واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کوئی تلمیح استعمال کی ہو۔ قلمرو روم یا رومی حکمرانوں کے سلسلے میں جتنی بھی تلمیحات ملتی ہیں ان کے ماخذات بھی فارسی تصانیف ہی تھے۔ اقبال اردو کے وہ پہلے شاعر تھے جن کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ انہوں نے برطانیہ میں قانون کی اور جرمنی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی سبب ان کے کلام میں نہ صرف یہ کہ قصہ طلب الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں بلکہ یہ الفاظ عرب اور عجم کے علاوہ یورپی تاریخ و ثقافت سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے برصغیر میں مغربی تعلیم رواج پاتی گئی ویسے ویسے اردو کی ادبی نگارشات میں یورپ، امریکہ اور دوسرے ممالک کی تاریخ و ثقافت سے متعلق تلمیحات کے استعمال میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں اس بات کی صراحت بھی ضروری ہے کہ تلمیح کا اطلاق صرف ان قصہ طلب الفاظ یا اسماء پر نہیں ہوتا جن کا تعلق قدیم تاریخ یا اساطیر سے ہو بلکہ ایک تخلیق کار اپنے علم و عرفان کے پیش نظر نئی تلمیحات ایجاد کر سکتا ہے جیسا اردو میں اقبال نے کیا اور ان کے بعد فیض اور کئی دوسرے شعراء نے۔

مطالعہ ادب اور خصوصاً مطالعۂ شعر میں جہاں زبان و بیان اور عروض کی باریکیوں سے کماحقہٗ نہ سہی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے وہیں کسی شعر یا کسی نظم میں اگر تلمیحی الفاظ استعمال ہوئے ہوں تو ان سے وابستہ قصے، کہانیوں یا واقعات کا علم بھی ضروری ہے۔ اس علم کی عدم موجودگی میں وہ شعر یا وہ نظم قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوگی۔ تلمیحات کے ذریعہ ہمیں انسانی تاریخ، معاشرت، مذاہب و اوہام، رسم و رواج، مصلحین انسانیت اور معرکہ آراؤں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ان معنوں میں مختصر تلمیحی الفاظ اپنے اندر وسیع مطالب و مفاہیم سمیٹے ہوتے ہیں۔ تلمیحات ہمیں کسی ادب کے ثقافتی مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کے کلاسیکی ادب کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اقبال سے قبل، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، تقریباً تمام اردو شعراء نے کم و بیش وہی تلمیحات استعمال کی تھیں جو فارسی میں رائج تھیں۔ قدم دکنی شعراء سے قطع نظر صرف نظیر اکبرآبادی ایک ایسے شاعر تھے جن کے کلام میں ہندوستانی تلمیحات کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وؔلی سے لے کر حاؔلی تک ہماری شاعری کا ثقافتی مزاج خالصتاً ایرانی تھا۔ نظیر اکبرآبادی نے اردو شاعری کو اپنی زمین یعنی ہندوستانی ثقافت سے متعارف کروایا اور یہ ان کی بہت بڑی عطا ہے۔ اقبال کے بعد گو ہماری شاعری

کا ثقافتی مزاج خالصتاً ایرانی تو نہیں رہا لیکن مکمل طور پر ہندوستانی بھی نہیں بن سکا۔ ہمارے شعراء نے ہندوستان کے مذہبی صحیفوں، اساطیر، رسم ورواج اور رزمیہ نظموں سے بہت کم استفادہ کیا۔ ترقی پسند شعراء، بشمول فیض احمد فیضؔ، نے بھی تلمیحات کے استعمال کے سلسلے میں عرب وعجم کے علاوہ یورپی تاریخ وثقافت سے تو استفادہ کیا لیکن ہندوستانی تلمیحات بہت کم استعمال کیں۔ اس ضمن میں فیضؔ کا معاملہ تو اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔ فیضؔ کی مادری زبان پنجابی تھی، ان کی بول چال کی زبان پنجابی تھی لیکن ان کے کلام میں ایک بھی ایسی تلمیح استعمال نہیں ہوئی جس کا تعلق پنجاب کی ثقافت سے ہو جبکہ پنجابی کی عشقیہ داستانیں.... ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، مرزا صاحبان اور سسّی پنوں.... نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی مشہور ہیں۔ یہ ایک بد بخت صورتحال ہے۔ ایک صحت منداور فعال زبان وادب کی جڑیں اپنے ملک ومعاشرے کی زمین میں پیوست ہونی چاہئیں پھر چاہے اس کی شاخیں آسمان کی بلندیاں چھو لیں۔

اردو میں دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں تلمیحات کا استعمال کم ہوتا ہے جس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ اردو کے تخلیق کار، خصوصاً شعراء، حصولِ علم اور مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ بھی ہے کہ علم فنِ شاعری کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوتا ہے لہٰذا جو شخص جتنا بڑا جاہل یا کم علم ہوگا اتنا ہی اوریجنل اور خلاّق شاعر ثابت ہوگا۔ یہ انتہائی غیر معروضی نقطۂ نظر ہے۔ ہمارے ملک کی ادبی تاریخ میں سوائے کبیر داس کے کسی اور شاعر کی مثال نہیں دی جاسکتی جو نرا جاہل ہونے کے باوجود بڑا شاعر تھا۔ تلمیحات کے کثرتِ استعمال سے کسی بھی زبان کے سرمایے میں لسانی وادبی ہر دو نقطۂ نظر سے قابل قدر اضافے ہوتے ہیں اور اظہار وترسیل میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انگریزی کی مثال سب پر عیاں ہے کہ اس زبان کے شعراء وادباء نے دنیا کے تقریباً ہر خطے کی تاریخ وثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے اتنی زیادہ تعداد میں تلمیحات استعمال کیں کہ ایک طرف انگریزی لسانی طور پر ایک مالدار زبان بن گئی تو دوسری طرف انگریزی ادب کی توقیر وتعظیم میں اضافہ ہوا۔ گو صرف اسی ایک وجہ سے کسی زبان کے ادب کو وقار یا عظمت نصیب نہیں ہوتی۔

شروع ہی میں ایک بات واضح کردی گئی ہے کہ میں نے لفظ تلمیح کو اسکے لغوی اور اصطلاحی ہر دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں تو وہ تمام الفاظ، محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں، اسماء اور اشعار آ گئے ہیں جو قصہ طلب یا تشریح طلب ہیں اور جو فیضؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ فیضؔ نے کچھ تلمیحیں ایجاد بھی کی ہیں اور کچھ افراد کے نام درج کئے ہیں جن کا

تعلق ان کی شخصیت اور فن سے ہے۔ میں نے اس طرح کے الفاظ اور اسماء کی بھی تشریح کی ہے مثلاً ان کے ایک شعری مجموعے کا نام ہے 'زنداں نامہ'۔ عمومی طور پر 'زنداں نامہ' قصہ طلب الفاظ نہیں ہیں لیکن خصوصی طور پر یہ الفاظ فیض کی زندگی کے دور اسیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان الفاظ نے ایک شخصی تلمیح کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ مزید برآں فیض کی ایک نظم '' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' ایتھل اور جولیئس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہوکر لکھی گئی۔ یہاں ایتھل اور جولیئس کے اسماء شخصی تلمیح کے زمرے میں نہیں آتے کیونکہ ان کا تعلق فیض کی زندگی سے نہیں بلکہ ان کے نظریات وعقائد سے ہے جن پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ دوسرے شعراء وادباء بھی کم وبیش ایقان رکھتے تھے۔ اس طرح یہ ایک نئی تلمیح ہے جسے فیض نے ایجاد کیا۔ بہرکیف میں نے حتی الامکان ایسے تمام اشاروں کی توضیح وتشریح کردی ہے جو کلیاتِ فیض میں ملتے ہیں تاکہ مطالعہ فیض میں سہولت ہو۔

۲

غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فیض احمد فیضؔ اردو کے ایسے شاعر ہیں جنہیں بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ اس شہرت کی کیا وجوہات تھیں اس پر بعد میں بحث ہوگی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فیضؔ نے اپنی شاعری کی تحدیدات کے باوجود نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آج بھی ان کے کلام کی وقعت ومقبولیت قائم ہے۔

فیض احمد خاں فیضؔ کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ خلیق انجم نے اپنے ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون '' فیضؔ بیتی'' میں تاریخ ولادت کے سلسلے میں فیضؔ کی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ فیضؔ لکھتے ہیں: '' تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ رجنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷ رجنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں اپنے ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ کے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ رفروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔'' (خلیق انجم کا مضمون '' فیضؔ بیتی'' مشمولہ 'اردو ادب' فیض احمد فیضؔ نمبر، دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۲۱) جہاں تک جائے پیدائش کا تعلق ہے تو تمام سوانحی ماخذات میں سیالکوٹ ہی ملتا ہے لیکن خلیق انجم

نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں لکھا ہے: ''فیض صاحب نے ایک دفعہ خود مجھے بتایا تھا کہ وہ کالا قادر گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔'' فیض کا آبائی گاؤں، کالا قادر، سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے حدود میں واقع ہے۔ فیض کے والد کا نام سلطان بخش تھا جسے انہوں نے بدل کر سلطان محمد خاں کر لیا تھا۔ فیض کے والد کے حالات اتنے دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں کہ بقول خلیق انجم ایک برطانوی نژاد خاتون ''للیز ہیملٹن نے انھیں بنیاد بنا کر The Wazir's Daughter کے نام سے ایک ناول لکھا ہے۔'' (ایضاً، ص ۲۰)

فیض کی ابتدائی تعلیم خالص مشرقی طرز پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید حفظ کرتے رہے۔ پھر سیالکوٹ کے مشن اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم سیالکوٹ کے مرے کالج میں حاصل کی ۔اسی اثناء میں اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔اے کیا۔ بعد ازاں عربی میں بی۔اے (آنرز) کی سند بھی حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں بھی ایم۔اے کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ایم۔اے۔او۔کالج، امرتسر میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ یہیں فیض کی ملاقات صاحبزادہ محمودالظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔ ان دونوں نے فیض کے نظریات اور عقائد کو اشتمالی سمت عطا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا اور فیض انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ دو سال بعد بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازم ہوئے۔ فوجی ملازمت اختیار کرنے کا سبب فسطائی اور آمرانہ قوتوں کی مزاحمت کرنا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اوائل میں نازی جرمنی اور سوویٹ یونین، ایک معاہدے کی رو سے، جنگ میں نہ ایک دوسرے کے حمایتی تھے اور نہ مخالف۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں جب ہٹلر نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سوویٹ یونین پر حملہ کیا تو دنیا بھر کے ترقی پسند اور اشتمالی عقائد میں یقین رکھنے والے افراد کی نظروں میں جنگ کی نوعیت بدل گئی۔ فیض نے اپنے عقائد و نظریات کے تحت یہ ضروری سمجھا کہ فسطائی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے عملی اقدام کرنا چاہئے اور اسی سبب انہوں نے فوجی ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۳ء میں ترقی پا کر میجر اور ۱۹۴۴ء میں لیفٹننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ دورانِ جنگ فیض نے کسی محاذ پر جا کر باضابطہ جنگ میں حصہ نہیں لیا بلکہ ان کا تعلق شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے تھا۔ ۱۹۴۶ء میں فوجی

ملازمت کے دوران بہتر کارکردگی کے لئے حکومت برطانیہ نے انھیں Member of Order of British Empire (M.B.E.) کے اعزاز سے نوازا۔ جب جنگ میں فسطائی قوتوں کو شکست ہوئی تو فیض کا مقصد پورا ہو گیا اور انھوں نے فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ فوجی ملازمت اختیار کرنے سے ایک سال قبل فیض نے ۱۹۴۱ء میں ایک برطانوی نژاد خاتون ایلس جارج سے شادی کر لی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کا اجراء ہوا اور فیض اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر ان کی زندگی کا وہ اہم واقعہ رونما ہوا جسے راولپنڈی سازش مقدمہ کہا جاتا ہے۔ اس کیس کے سلسلے میں انھیں ۱۹۵۱ء میں گرفتار کیا گیا اور چار سال سے زائد عرصہ جیل میں گذارنے کے بعد رہا ہوئے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انھیں پھر گرفتار کیا گیا اور پانچ مہینوں بعد رہا کئے گئے۔ فیض عملی سیاست میں کبھی سرگرمِ عمل نہیں تھے اور نہ کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر رہے۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد مزدور تحریک سے وابستہ ضرور تھے۔ وہ محکمۂ ڈاک اور تار اور ریلوے ملازمین کی یونین کے سربراہ تھے اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر۔ ۱۹۶۲ء میں حکومتِ سوویٹ یونین نے فیض کو لینن پیس پرائز دیا جو اس زمانے میں کمیونسٹ بلاک کا نوبل پرائز سمجھا جاتا تھا۔ عمر کے آخری برسوں میں وہ زیادہ تر بیروت میں مقیم رہے جہاں وہ افرو ایشین رائٹرز فیڈریشن کے ترجمان "لوٹس" کے مدیر تھے۔ ۲۰ رنومبر ۱۹۸۴ء کو انتقال کیا۔

فیض نے شاعری کی ابتداء تو دسویں جماعت ہی سے کر دی تھی اور ایم۔ اے تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ شاعری کرنے لگے تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ "نقش فریادی" ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اور ساتواں مجموعۂ کلام "مرے دل مرے مسافر" ۱۹۸۱ء میں چھپا۔ ان مجموعوں کے بعد کا کلام یکجا کر کے ایک مختصر سا مجموعۂ کلام "غبارِ ایام" کے نام سے شائع کیا گیا جو ان کی کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں شامل ہے۔ نثر میں فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ "صلیبیں مرے دریچے میں" (ایلس کے نام انگریزی خطوط کا ترجمہ، ۱۹۷۱ء)، "متاعِ لوح و قلم" ۱۹۷۳ء، ہماری قومی ثقافت" ۱۹۷۶ء اور "مہ و سال آشنائی" (یادداشتیں) فیض کی دوسری نثری کتابیں ہیں۔

فیض اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ بن گئے تھے اور آج بھی جبکہ ترقی پسند تحریک تقریباً دم توڑ چکی ہے اور سوویٹ یونین کا شیرازہ بکھرنے کے بعد کمیونزم پر بھی ضرب کاری لگ چکی ہے، فیض کی شاعری کی مقبولیت برقرار ہے۔ ان کی اس عالم گیر شہرت کے کیا اسباب ہیں اس تعلق سے ناقدین

ادب کی مختلف رائے ہیں۔ ان کے مخالفین اکثر یہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی سازش کیس میں ان کی گرفتاری اور اسیری کی وجہ سے فیض کو شہرت نصیب ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے فیض کے نام کو اچھالا گیا۔ کچھ ناقدین ایسے بھی ہیں جو فیض کی شہرت کی توجیہہ بڑے بھونڈے طور پر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ پنجابی تھے اور پنجابی لوگ اپنے آدمی کی تشہیر کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے مخالفین کی رائے میں فیض کی شہرت کے اسباب سیاسی تھے نہ کہ ادبی۔ اگر معروضی نقطۂ نظر سے ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو یہ تمام توجیہات باطل قرار پاتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ اردو کے کئی شعراء وادباء گرفتار کئے گئے تھے اور انہوں نے قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ راولپنڈی سازش کیس میں فیض کے ساتھ سجاد ظہیر بھی گرفتار ہوئے تھے جو شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ جہاں تک بائیں بازو کی سیاست اور اس سے وابستہ عناصر کی سرگرمیوں کا سوال ہے تو سجاد ظہیر نہ صرف یہ کہ پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے بلکہ تحریک کے ضمن میں ان کی حیثیت ایک کیسار (Commissar) کی تھی۔ تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ سجاد ظہیر بحیثیت شاعر یا افسانہ نگار فیض کی طرح مقبول کیوں نہ ہو سکے؟ ہندوستان میں مخدوم محی الدین کی مثال سامنے کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین باضابطہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ وہ زندگی بھر عملی سیاست اور مزدور تحریک سے وابستہ رہے اور فیض سے کہیں زیادہ قید و بند کی تکالیف اٹھائیں۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مخدوم کو بھی وہی عالم گیر شہرت نصیب ہوئی جو فیض کے حصے میں آئی۔ لہٰذا اسیری یا بائیں بازو کی سیاست سے فیض کی وابستگی ان کی شہرت کا سبب نہیں تھی۔ رہی بات ان کے پنجابی ہونے کی تو یہ ان کی مقبولیت کی توجیہہ نہیں بلکہ علاقائی عصبیت کی بدترین مثال ہے۔ نذر محمد خاں راشد اور فیض احمد فیض دونوں پنجابی تھے۔ دونوں نے شاعری تقریباً ایک ساتھ شروع کی۔ دونوں کا تعلق پنجاب کے مراعات یافتہ طبقہ سے تھا بلکہ راشد کی حیثیت تو پاکستان کے ڈپلومیٹ کی تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی کہ راشد عالم گیر سطح پر فیض کی طرح مقبول نہ ہو سکے؟

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میں لفظ مقبولیت کو عظمت کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے میں بڑی حد تک ذاتی ترجیحات کا عمل دخل ہوتا ہے اور ایک ناقد یا قاری اپنی ترجیحات کی بناء پر ہی کسی فنکار کے سینے پر

'عظیم شاعر' یا 'عظیم ادیب' کا تمغہ لگاتا ہے۔ یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے اور اس موضوع پر منطقی یا معروضی طریقے پر بحث نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس مقبولیت ایک سائنسی مظہر (Scientific Phenomenon) ہے جسے ناپا تولا جا سکتا ہے۔ جہاں تک فیض کا تعلق ہے تو اس بات پر تو ان کے مخالفین بھی متفق ہیں کہ وہ عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔

فیض کی بے پناہ مقبولیت کے اسباب ہمیں ان کی شاعری، ان کے عقائد و نظریات اور ان کی شخصیت ہی میں تلاش کرنے ہوں گے۔ فیض نے کبھی منصوبہ بند طریقے پر شاعری نہیں کی یعنی ارادی طور پر کبھی کسی طویل اور معرکۃ الآرا نظم کی تخلیق میں منہمک نہیں ہوئے۔ یہاں مکتبی ذہنیت رکھنے والے افراد یہ ضرور کہیں گے کہ شاعری میں ارادہ یا منصوبے کا کیا دخل؟ یہ تو ایک وہبی اور الہامی فن ہے۔ اس نظریے کی تشہیر ان لوگوں نے بہت زیادہ کی جو اپنے 'تنقیدی' مضامین میں دوٹوک فیصلے سنانے کے عادی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فردوسی (شاہنامہ)، سودا (قصائد)، انیس (مراثی)، حالی (مدوجزر اسلام)، اقبال (شکوہ اور جوابِ شکوہ)، حفیظ جالندھری (شاہنامۂ اسلام) وغیرہ کی مذکورہ تخلیقات میں ان کے ارادے اور ضبط و تنظیم کی بڑی کارفرمائی تھی۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ ان میں سے کتنی تخلیقات کو صحیح معنوں میں 'عظیم شاہکار' کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ فیض نے اپنی شاعری کی دھاک قائم کرنے کے لئے کبھی کوئی پرشکوہ (Grandiose) منصوبے نہیں بنائے۔ انہوں نے تو صرف ان احساسات و جذبات کو رقم کیا جو ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے رہے۔

موضوعاتی طور پر فیض کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی ان کی رومانی یا عشقیہ شاعری اور ان کی نظریاتی یا تبلیغی شاعری جس کے ذریعہ فیض نے دنیا بھر کے زیردستوں، مظلوموں اور محکوموں کو احتجاج کرنے کے لئے زبان بخشی۔ لیکن یہ دونوں موضوعات فیض کے کلام کی مقبولیت کی دلیل بننے میں اس لئے ناکام ہوتے ہیں کہ ان میلانات کی نشاندہی تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہر اہم شاعر کے کلام میں کی جا سکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فیض نے ان موضوعات کو کس انداز سے برتا۔ فیض دراصل لہجے یا اسلوب کے شاعر ہیں اور یہی لہجہ ان کی شناخت بھی ہے اور ان کی مقبولیت کی دلیل بھی۔ یہ لہجہ درحقیقت ان کی منکسر المزاج اور بردبار شخصیت کا عکس ہے جو ان کے کلام میں سحر انگیزی پیدا کرتا ہے۔ لہجے کی شاعری میں مقبول ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ داغ دہلوی صرف اپنے لہجے کی کھنک کی وجہ ہی سے اپنے وقت کے مقبول ترین غزل گو تھے اور آج بھی ان کا شمار اردو کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ داغ کا لہجہ زبان کے چٹخارے، محاورے کی

چاشنی اور روزمرہ کی مہک کا مرکب تھا جبکہ فیضؔ اپنے دھیمے، شیریں، خوابیدہ اور بنیادی طور پر رومان زدہ لہجے کی وجہ سے مقبولیت کی منزلیں طے کرتے گئے۔ فیضؔ کے لہجے کی خوابناکی اور نغمگی نے درحقیقت ان کی شاعری کو خطابت اور نعرہ بازی سے محفوظ رکھا ہے۔ بات چاہے مزدوروں کے استحصال کی ہو رہی ہو یا وارداتِ عشق و حسن کا بیان فیضؔ نے ہر قسم کے مضمون کا شعری اظہار اپنے غنائیہ لہجے ہی میں کیا۔

غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

اس استدلال میں اب بھی ایک نقص باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اگر فیضؔ صرف اپنے لہجے کے برتے پر ہی عالم گیر شہرت کے مالک بن گئے تو یہ واقعہ داغؔ کے ساتھ کیوں نہیں پیش آیا۔ اس کا جواب ہمیں فیضؔ کی وسیع المشربی اور ان کے عالمی زاویۂ نگاہ (Worldview) میں مل سکتا ہے۔ داغؔ ایک فیوڈل معاشرے کے پروردہ تھے اور وہ اس معاشرے کی اقدار توڑ کر باہر آنے میں ناکام رہے۔ غالبؔ بھی فیوڈل معاشرے کا حصہ تھے لیکن ان کے تفکرات، اعلیٰ انسانی اقدار میں ان کا ایقان اور ان کے تشکیکی رویے کی وجہ سے ان کے کلام میں آفاقی سچائیوں کا اظہار ملتا ہے۔ غالبؔ اور فیضؔ میں یہی قدر مشترک ہے۔

فیضؔ نے اپنے لہجے کی وجہ سے برصغیر میں شہرت حاصل کی اور اپنے وسیع وژن کی وجہ سے عالمی سطح پر مقبولیت پائی۔ اس وژن کی تہذیب و ترتیب میں ان کے وسیع مطالعہ، مزدور تحریک سے وابستگی اور اشتمالی عقائد و نظریات میں ان کے ایقان نے بہت اہم کردار نبھایا۔ فیضؔ ایک کٹر اشتمالی نہیں تھے بلکہ انسان دوستی اور محکوم و مظلوم انسانوں کی حمایت ان کے نزدیک بنیادی قدریں تھیں۔ پاکستان کے استحصال زدہ مزدوروں کے مطالبات ہوں یا ایرانی طلباء کا احتجاج، کینیا کے حریت پسندوں کی جدوجہد ہو یا فلسطینی مجاہدین کی تحریکِ آزادی، فیضؔ نے تمام دنیا کے زیردستوں اور مظلوموں کے مسائل و آزار کو اپنے مخصوص غنائی لہجے میں شعری پیرایہ عطا کیا اور اسی میں ان کی عالم گیر مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔

۳

ایک اور نکتہ کی صراحت ضروری ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں فیض احمد فیضؔ کی کلیات کا وہ

نسخہ میرے پیشِ نظر رہا جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۱۹۹۴ء میں "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے شائع کیا۔ لہٰذہ تلمیحات کی ترتیب اور صفحات کی نشاندہی اسی نسخے کی مدد سے کی گئی۔ گو میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ اس کلیات میں شامل تمام شعری مجموعوں اور منظومات میں بیان کردہ اسماء اور تلمیح طلب الفاظ پر روشنی ڈال سکوں، تاہم اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ کتاب کا دائرہ فیضؔ کے صرف اردو کلام تک محدود ہے۔ کلیات میں شامل ان کی پنجابی اور اکا دکا فارسی منظومات زیرِ غور نہیں رہیں۔ اردو کلام میں بیان کردہ چند اسما، میری کوشش کے باوجود، تشریح طلب رہ گئے۔ اگر کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور اس کی اشاعتِ دوّم کا موقعہ آئے تو اس کوتاہی کا ازالہ کر دیا جائے گا۔

۴

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں سب سے پہلے میں اپنی دوست اور سڈنہم کالج ممبئی، میں اقتصادیات کی لکچرر فردوس قادری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ضروری ماخذات کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ انھیں فراہم بھی کیا۔ نیز انہوں نے مسوّدہ کا بہ نظرِ غائر مطالعہ فرما کر بہت ہی مفید اور کار آمد مشورے دیئے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس کتاب کی تزئین ان کے ہی ذوقِ حسن کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا سرورق ان کے موقلم کی جنبش کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح میں ایک اور رفیق کار محترمہ شائستہ خان، صدر شعبۂ فارسی، اسماعیل یوسف کالج ممبئی، کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے فارسی اشعار کی تشریح کے سلسلے میں میری مدد کی۔

میں نے یہ کتاب تقریباً تین برس قبل مکمل کر لی تھی۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں مالی تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مہاراشٹر اردو اکادمی سے ربط بھی پیدا کیا تھا۔ ان دنوں اکادمی کی کارکردگی میں سیاسی اور غیر ادبی اغراض و مقاصد کا کچھ زیادہ ہی عمل دخل تھا لہٰذہ دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اکادمی کی جانب سے مالی اعانت کے تیقّن کا مراسلہ موصول نہیں ہوا۔

اس اثناء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی تشکیلِ نو کی گئی۔ نئی کمیٹی نے کتاب کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت کی جس کے لئے میں اکادمی کے اراکین، خصوصی طور پر جناب ساجد رشید، ممبر سکریٹری کا ممنون ہوں۔

اسے میری خوش بختی ہی سمجھئے کہ اتفاقاً کتاب کا مسودہ انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر، جناب ڈاکٹر آدم شیخ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے یہ کتاب شائع کی جائے۔ انجمنِ اسلام کے صدر، جناب ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، نے بھی تجویز سے اتفاق کیا۔ اس طرح کتاب کی اشاعت ہو سکی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر میں جناب ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا اور جناب ڈاکٹر آدم شیخ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ دونوں صاحبان کی عالمانہ بصیرت اور ادب شناس نظروں نے مسودّہ کو ضائع ہونے سے بچالیا۔

ظہیر علی

باندرہ، ممبئی

۱۳ر مارچ ۲۰۰۱ء

نقشِ فریادی

تلمیح ۱ : نقش فریادی

نقشِ فریادی ......فیض احمد فیض کے اوّلین مجموعے کا نام غالبؔ کے شعر سے مستعار ہے جو دیوانِ غالبؔ کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

فیض نے لفظ نقش کو اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے نقشِ فریادی کی ترکیب اختراع کی۔ غالبؔ کی مقبولیت کے ساتھ اس شعر کا شمار بھی اردو کے مقبول ترین اشعار میں ہوتا ہے لیکن خود غالبؔ کے زمانے میں ان کے کئی معترضین اسے ایک مہمل شعر کہا کرتے تھے۔ غالبؔ نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے:

''تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لئے اسے فریادی کہا کیونکہ ولایتِ ایران میں فریادی کاغذی پیراہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ چونکہ ہستی موجب ملال و آزار ہے اسلئے تصویر بھی اپنے صانع کی بہ زبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھے بنا کر کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا۔''

غالبؔ کے معترضین اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ تاریخ ایران میں کسی زمانے میں بھی ایسا رواج نہیں تھا اور اسی سبب ان کے نزدیک یہ شعر مہمل تھا۔ اگر یہ دلیل مان بھی لی جائے کہ کاغذی پیراہن پہن کر عدالت میں جانے کا رواج ایران میں فی الواقع کبھی نہیں تھا تب بھی شعر کو مہمل قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ادبی روایات میں کاغذی پیراہن کا وجود بمعنی فریادی موجود ہے۔ ناطق گلاؤٹھی نے ''کنز المطالب، شرح دیوانِ غالب'' میں کلیم کاشانی کا یہ شعر بطور سند نقل کیا ہے۔

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد
زادہٴ خاطرِ من تا بدہی داد مرا

مطلب: آپ کاغذی لباس زیب تن کر کے عدالت میں تشریف لائے ہیں لیکن میرا دل تو اس وقت مطمئن ہوگا جب مجھے آپ کی جانب سے انصاف ملے گا۔ صرف منصف کا لباس پہن کر انصاف کی کرسی پر بیٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ حاکم و منصف وہی ہوتا ہے جو صحیح انصاف کرے۔

1333

علاوہ ازیں اردو شاعری میں بھی کاغذی پیراہن کو بمعنی فریادی استعمال کرنے کی روایت موجود ہے۔ مومنؔ نے اسے یوں استعمال کیا ہے ؎

تظلّم فرقِ معنی کے سبب تھا
لباسِ کاغذی بے وجہ کب تھا

فیضؔ کو مرزا غالبؔ سے بے انتہا عقیدت تھی۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ سوتے وقت دیوانِ غالبؔ اور دیوانِ حافظ کی جلدیں اپنے سرہانے رکھا کرتے تھے۔

غالبؔ کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ مرزا نوشہ لقب، نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ خطابات تھے۔ غالبؔ کی ولادت ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی اور انھوں نے ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں وفات پائی۔

غالبؔ کے خاندانی حالات کا پتہ خود ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے آباء واجداد ایک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلۂ نسب تورا ابن فریدون تک پہنچتا ہے۔ مرزا غالبؔ کے دادا شاہ عالم کے دور میں سمر قند سے ہندوستان آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی دختر سے ہوئی تھی خواجہ غلام حسین سرکارِ میرٹھ کے ایک اعلیٰ فوجی تھے۔ عبداللہ بیگ کئی ریاستوں میں اعلیٰ فوجی افسر رہے۔ اخیر میں ریاستِ الور کی فوج سے وابستہ ہوئے اور ایک خانہ جنگی کے دوران میدانِ جنگ میں انتقال کیا۔ راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد غالبؔ کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے کی۔

غالبؔ کی تعلیم و تربیت آگرہ ہی میں ہوئی۔ شیخ معظم، جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلم تھے، غالبؔ کو تعلیم دینے پر مقرر تھے۔ مولانا حالیؔ "یادگارِ غالبؔ" میں لکھتے ہیں:

"......ایک شخص پارسی نژاد، جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔"

تاہم یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ کیا واقعی کسی عبدالصمد نامی شخص نے غالبؔ کو فارسی زبان کی تعلیم دی یا جیسا کہ خود غالبؔ نے لکھا ہے:

"مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک

فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا۔"

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ نے نہ تو فنِ شاعری میں کسی کی شاگردی کی اور نہ کسی رنگ کی پیروی۔ خود اپنا انداز ایجاد کیا جس نے اردو شاعری کو وقار اور اردو غزل کو اعتبار بخشا۔

ظرافت، متانت، اخلاق اور شگفتگیٔ مزاج ان کی طبیعت کی خصوصیات تھیں۔ اپنے احباب کے نام جو خطوط انہوں نے لکھے ان میں ان خصوصیات کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ غالبؔ کا طرزِ تحریر تا حال اردو نثر کا بہترین نمونہ ہے۔

غالبؔ کے مزاج کو فارسی زبان سے ازلی مناسبت تھی جس کی وجہ سے ان کے ابتدائی کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ بعد کے دور کی غزلوں میں سلاستِ زبان اور روانی نمایاں ہے۔ دراصل پروازِ تخیل، فکر و خیالات کی بلندی کے اظہار کے لئے غالبؔ کو مجبوراً فارسی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس ڈکشن کی بازگشت بعد میں ہمیں اقبالؔ کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے۔

غالب بنیادی طور پر غزل گو تھے تاہم انہوں نے قصیدہ، مثنوی، رباعیات، مدح اور قطعہ جیسی اصنافِ سخن کو بھی استعمال کیا۔ اردو غزل کو غالبؔ نے سب سے پہلے روایتی موضوعات سے آزاد کرا کے اسے دانشورانہ اور مفکرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسی سبب اردو شاعری میں ان کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند قرار پایا۔

تلمیح ۲ : غالبؔ

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فیضؔ نے "نقشِ فریادی" کے شروع میں مرزا غالبؔ کا مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں عالموں، دانشوروں اور باکمال افراد کا بنیادی فریضہ تصنیف و تالیف رہا ہے۔ اس شعر میں غالبؔ فرماتے ہیں کہ وہ رسمِ وفا کی تالیف کا کام اس وقت سے انجام دیتے رہے ہیں جب وہ سنِ شعور کو بھی نہ پہنچے تھے۔ یعنی بہت کم سنی میں میں انہوں نے فنِ وفا کے باب میں وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جو ایک عالم یا دانشور تصنیف و تالیف کے باب میں حاصل کرتا ہے۔

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ فیضؔ کے کلیات "نسخہ ہائے وفا" کا نام بھی اسی شعر سے مستعار ہے۔ غالبؔ کے حالات کے لئے دیکھئے۔ تلمیح ا۔

تلمیح ۳: عرفیؔ

برو اے عقل و منہ منطق و حکمت درپیش
کہ مرا نسخۂ غمہائے فلاں درپیش است

"نقشِ فریادی" کے ص ۱۱ پر فیضؔ نے فارسی کے مشہور شاعر عرفیؔ کا مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے۔

شعر کا مطلب: اے عقل جا! اپنی منطق وحکمت میرے سامنے مت رکھ۔ مجھے سکھانے کی کوشش نہ کر۔ فی الحال کئی غم میرے سامنے ہیں اور ان غموں کے نسخے (علاج) مجھے تلاش کرنے ہیں اور تیرے (عقل کے) پاس نہیں ہیں۔ (اہل معرفت صرف عشق کو منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس شعر میں عقل مددگار ثابت نہیں ہوسکتی۔)

عرفیؔ کا نام محمد تھا اور لقب جمال الدین۔ والد کا نام زین الدین علوی اور دادا کا جمال الدین چادر باف۔ ان کے تخلص، عرفیؔ کے تعلق سے شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں لکھا ہے:

"ایران میں ان محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتیں 'عرف' کہتے ہیں۔ عرفیؔ کا باپ شیراز کے دارالحکومت میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھا۔ عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفیؔ رکھا تھا۔"
(جلد اول، ص ۷۳)

عرفیؔ کی ولادت شیراز میں ہوئی تھی۔ سنِ ولادت کے تعلق سے قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ کئی محققین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ان کی وفات ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ہوئی۔ یہ بات بھی طے ہے کہ عرفیؔ نے بہت کم عمری میں انتقال کیا یعنی ۳۶ یا ۳۷ برس کی عمر میں۔ اگر ۳۷ کے عدد کو ۹۹۹ میں سے منہا کردیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔

عرفیؔ نرگسیت کی حد تک خود پرستی اور تکبر کے شکار تھے۔ انھیں اپنے عالی نسب ہونے پر

بہت فخر تھا۔ چونکہ ایران کے کئی نامور شعراء معمولی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً خاقانی بڑھئی تھے، فردوسی کا پیشہ باغبانی تھا اور باقر کاشانی خردہ فروش تھے، جبکہ عرفی کے والد سرکاری محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اسی لئے وہ خود کو اپنے سے پہلے اور اپنے ہم عصر شعراء سے اعلیٰ اور برتر سمجھتے تھے۔ ان کا عرفی تخلص اختیار کرنا اسی جذبے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی۔ انہوں نے علوم متداولہ کی تحصیل کے علاوہ مصوری اور نقاشی کی تعلیم بھی مکمل کی تھی۔ عرفی نے کم سنی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنے وقت کے بڑے بڑے پرانے استادوں سے معرکے بھی کئے۔ اسی لئے بہت جلد بحیثیت شاعر ایران میں ان کا نام مشہور ہو گیا۔ وہ چاہتے تو ایران کے دربار سے بھی منسلک ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ بعض تذکروں میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ عرفی شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے حسن پر غائبانہ طور پر عاشق ہو گئے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کی راہ لی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دورانِ سفر ڈاکوؤں نے ان کا تمام مال و متاع لوٹ لیا جس کے ساتھ عرفی کا شعری سرمایہ بھی ضائع ہو گیا تھا۔

ہندوستان پہنچ کر عرفی نے فیضی کے دربار کا انتخاب کیا کیونکہ وہ انھیں ایک سخن شناس شخص سمجھتے تھے۔ فتح پور سیکری میں عرفی نے فیضی سے ملاقات کی اور فیضی نے ان کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ پھر فیضی کے توسط سے انہوں نے دربار اکبری میں رسائی کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد میں عبدالرحیم خان خاناں کے دربار سے منسلک ہو گئے جو خود شاعر ہونے کے باوصف شعراء کی سرپرستی کے لئے مشہور تھے۔ اسی دربار سے ایک اور مشہور فارسی شاعر نظیری بھی منسلک تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں شعراء کے مابین ادبی چشمک ہوتی رہتی تھی۔

فارسی ادب کے ناقدین کا خیال ہے کہ عرفی اپنی فطری حریت پسندی کی وجہ سے صنف قصیدہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان میں ان کی شہرت کا تعلق ہے تو اس کا سبب ان کے قصیدے ہی ہیں۔ عرفی ایک مشکل پسند شاعر تھے۔ دور از کار استعارات اور تشبیہات استعمال کرنے کے شوقین تھے۔ ان کی شاعری کی اساس جذبہ یا وجدان نہیں بلکہ فکر و عقل ہے۔

تلمیح ۲: نظم "حسینہ خیال سے" ص ۲۲

فیض کی یہ نظم براؤننگ کی جس نظم سے ماخوذ ہے اس کا عنوان ہے "آرمیکس اور یوری
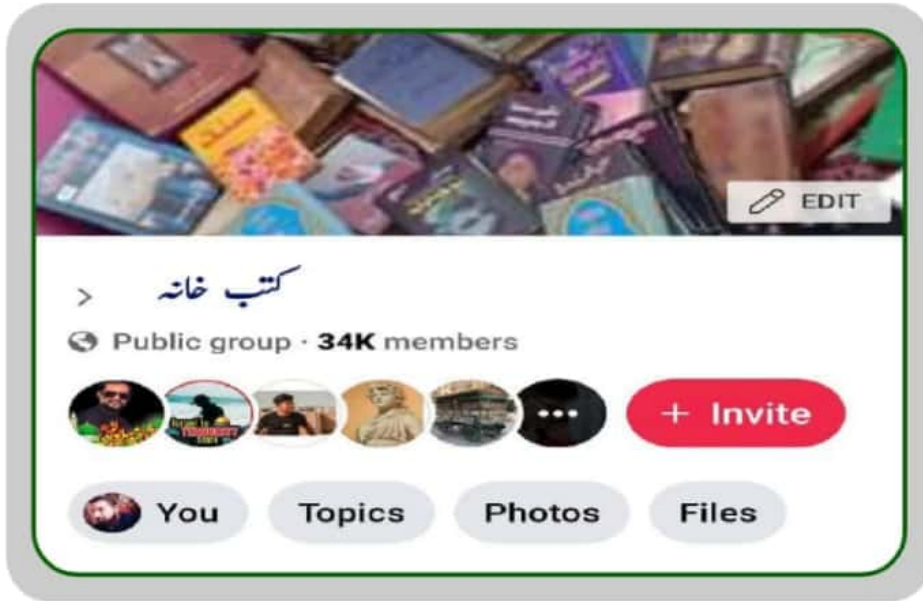
ڈائس (Orpheus and Euridice)

اصل نظم یوں ہے:

But give them me, the mouth, the eyes, the brow!
Let them once more absorb me! One look now—
Will lap me round for ever, not to pass
Out of its light, though darkness lie beyond:
Hold me but safe again within the bond
If one immortal look! All woe that was,
Forgetten, all terror that may be
Defied____ no past is mine, no future:
Look at me!

یونانی اساطیر کی رو سے یوری ڈائس ایک عظیم موسیقار آرفیئس کی بیوی تھی۔ جس کے نغموں سے نہ صرف جاندار مخلوق بلکہ سمندر اور پہاڑ بھی سرشار ہو کر جھومنے لگتے تھے۔ جب یوری ڈائس کا انتقال ہوا تو آرفیئس نے پلوٹو دیوتا سے التجا کی کہ اس کی بیوی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ پلوٹو نے اس کی التجا اس شرط پر منظور کی کہ وہ اپنی بیوی پر اس وقت تک نظر نہیں ڈالے گا جب تک وہ پاتال سے نکل کر دنیا میں نہ پہنچ جائے۔ آرفیئس نے پلوٹو کی یہ شرط منظور کر لی لیکن اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔ دنیا میں پہنچنے سے قبل ہی اس نے مڑ کر اپنی بیوی کو دیکھ لیا جس کے سبب وہ دوبارہ اس سے جدا کر دی گئی۔ براؤننگ کی یہ نظم اسی یونانی دیومالا پر مبنی ہے۔

انگریزی کا مشہور شاعر براؤننگ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۸۹ء میں وفات پائی۔ ٹینی سن جیسا باکمال اور بلند قامت شاعر اس کا معاصر تھا لیکن براؤننگ کا اسلوبِ اظہار ٹینی سن سے بالکل مختلف ہے۔ شدتِ جذبات اس کی شاعری کی اہم ترین صفت ہے اور جذبات کی یہی رو بعض دفعہ اس کے کلام کو ابہام کے دائرے میں بہا لے جاتی ہے۔ تاہم بحیثیت شاعر انگریزی ادب میں براؤننگ کی حیثیت مسلّم ہے۔ اسکے تخلیقی جوہر ان نظموں میں اپنی آب و تاب دکھاتے ہیں جن کا اسلوب ڈرامائی ہے۔ براؤننگ کے فن کا بہترین اظہار ڈرامائی خود کلامی (Soliloquy) میں ہوا ہے۔ ۱۸۴۶ء میں براؤننگ نے ایلزبتھ بیرٹ سے شادی کی تھی جو اس زمانے میں بحیثیت شاعر اس سے بھی زیادہ مشہور تھی۔

تلمیح ۵: نظامیؔ

ع "دلے بفروختم جانے خریدم"

''نقشِ فریادی'' کے بابِ دوم کی شروعات کی اطلاع دینے کی غرض سے فیض نے نظامی کا مندرجہ بالا مصرعہ ص ۵۱ پر نقل کیا ہے۔ مجموعے کو خود فیض نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے حصے میں رومانی اور جذباتی شعری تخلیقات شامل ہیں جو ان کی ابتدائی شاعری تھی اور جس کا اختتام ۱۹۳۰ء کے آس پاس ہوا۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے ایماء پر چونکہ فیض کی نظموں اور غزلوں کی فکری اور موضوعاتی نہج بدل گئی تھی اور یہی کلام ''نقشِ فریادی'' کے دوسرے حصے میں شامل ہے۔ اس تبدیلی کو ظاہر کرنے کے لئے فیض نے نظامی کا مصرعہ '' دلے بفروختم جانے خریدم'' استعمال کیا ہے۔

مصرعے کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ میں نے اپنا دل فروخت کردیا اور اس کے بدلے جان خرید لی۔ فیض کے کلام کے پیشِ نظر اگر ہم دل کی جگہ غمِ جاناں اور جان کی جگہ غمِ دوراں استعمال کر کے دیکھیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

فارسی کے مثنوی گو شعراء میں نظامی گنجوی کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا نام محمد الیاس یوسف تھا اور تخلص نظامی۔ والد کا نام موید تھا۔ شبلی نعمانی کی تحقیق کی رو سے ان کا آبائی وطن تغرش تھا جو قم کے اضلاع میں ایک ضلع ہے لیکن عام طور پر ان کا وطن گنجہ مشہور ہے اور اسی مناسبت سے گنجوی کہلاتے ہیں۔ [۱] ان کے والد گنجہ میں آ بسے تھے۔ نظامی گنجہ ہی میں پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت کے تعلق سے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شبلی نے ۵۳۳ھ (۱۱۳۸ء) لکھا ہے۔ [۲] جبکہ ڈاکٹر زہرا خانلری ۵۳۵ھ (۱۱۴۰ء) بیان کرتی ہیں [۳] سنِ وفات عام طور پر ۵۹۶ھ (۱۱۹۹ء) سمجھا جاتا ہے۔

نظامی کو علم و ادب ورثے میں ملا تھا۔ ان کے بھائی قوامی مطرزی بھی ایک قابل قدر شاعر تھے۔ اس لئے شروع ہی سے نظامی کی تعلیم و تربیت بڑی باضابطگی سے ہوئی۔ درویش صفت شخص تھے اور سلسلۂ طریقت میں واخی فرج زنجانی کے مرید تھے۔

نظامی نے جب شعر کہنا شروع کیا تو بہت جلد ان کی شہرت تمام ایران میں پھیل گئی اور مختلف درباروں سے انھیں دعوت نامے ملنے شروع ہوئے۔ نظامی مستقلاً کسی دربار سے منسلک تو نہیں ہوئے لیکن مختلف بادشاہوں کی فرمائشوں پر اپنی مثنویوں کی تخلیق کی۔ چنانچہ ازرنجان اور کماخ کے علاقے کے حکمراں، بہرام شاہ کے اصرار پر '' مخزن الاسرار''، سلجوقی حکمران، سلطان طغرل بن ارسلان کی

---

۱ اور ۲۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد ص ۲۵۵
۳۔ ڈاکٹر زہرا خانلری "فارسی کی دلکش داستانیں" ترجمہ از ڈاکٹر نورالحسن انصاری، ص ۱۵۳

فرمائش پر" شیریں خسرو"، شاہِ آذربائیجان، منوچہر خاقان کی تحریک پر"لیلیٰ مجنوں" اور سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاؤالدین آقنقری کی خواہش پر" ہفت پیکر" جیسی شہرہ آفاق مثنویاں لکھیں۔ پانچویں مثنوی "اسکندر نامہ" نظامیؔ نے کسی فرمانروا کے حکم پر نہیں بلکہ اپنی مرضی ومنشاء سے لکھی اور تکمیل کے بعد اسے سلطان ابوبکر نصرت الدین کے نام موسوم کیا۔

نظامیؔ کی ان پانچوں مثنویوں کو مجموعی طور پر خمسہ کہا جاتا ہے۔ان مثنویوں کے علاوہ نظامیؔ نے غزلیں، قصیدے اور قطعات بھی لکھے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کا تمام کلام محفوظ نہیں کیا گیا۔ تذکروں میں چند قصائد، غزلیات اور قطعات ملتے ہیں لیکن یہ کام اس پائے کا نہیں جو ان کی مثنویوں کا خاصہ ہے۔

تلمیح ۲ : اقبالؔ

(ڈاکٹر محمد اقبالؔ کے متعلق فیضؔ کا منظوم نذرانہ عقیدت، ص ۷۷)

اقبالؔ کی ولادت ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں ہوئی اور انتقال ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہوا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے۔ فلسفہ میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن گئے جہاں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی لی۔ پھر لاہور پلٹ آئے اور وکالت شروع کی۔ کچھ عرصے تک کالج میں بھی پڑھایا۔ساتھ ہی سماجی اور سیاسی مسائل میں دلچسپی بھی لیتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت بھی کی۔

اقبالؔ کی اردو شاعری کو فکری اور موضوعاتی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔اردو کی شعری روایت کے پیشِ نظر اقبالؔ نے بھی شاعری کی ابتداء غزل سے کی اور داغؔ دہلوی سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح بھی لی۔تاہم اقبالؔ ایک صاحبِ فکر انسان تھے۔ان کی فکری پرواز داغؔ کی غزل کے محدود دائرے میں مقید نہیں رہ سکتی تھی۔ان کی شاعری کا پہلا دور سفرِ انگلستان (۱۹۰۳ء) پر ختم ہوتا ہے۔اس دور میں ان کا کلام وطنیت اور قومیت کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔دوسرا دور ان کے قیامِ انگلستان سے شروع ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے یورپ کی سیاست اور مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔نتیجتاً انہوں نے وطنیت اور قومیت کو عالمِ انسانیت کے لئے مضر سمجھا اور انسان کی نجات کے لئے اسلامی اخوت، رواداری، خودی اور جذبہ عمل کی تبلیغ شروع کی۔ تیسرے

دور میں وہ ایک مفکر اور حکیم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

اقبال اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کو نہ صرف مغربی مفکروں کے خیالات سے روشناس کرایا بلکہ زبان و بیان کی نادر تشبیہوں سے بھی اردو کی آبیاری کی۔ کبھی کبھی ان کی زبان حد درجہ مفرس اور ثقیل ہو جاتی ہے تاہم ان کے مفکرانہ خیالات کے اظہار کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ اردو شاعری میں میر اور غالب کے بعد اقبال کی اہمیت مسلّم ہے۔

اقبال پر اپنی یہ نظم فیض نے گورنمنٹ کالج، لاہور کے سالانہ مشاعرے (۱۹۳۱ء) میں پڑھی تھی۔ مشاعرہ، مقابلے کی صورت میں ہوا تھا اور موضوع تھا "اقبال"۔ اس نظم پر فیض کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ اقبال خود بھی مشاعرے میں موجود تھے۔

تلمیح ۷: خسرو

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

(غزل، ص ۸۰)

خسرو عام طور پر ایران کے تمام بادشاہوں کا لقب رہا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں "عادل بادشاہ"۔ تاہم ایران کے دو بادشاہوں کے ساتھ یہ لقب بطور خاص استعمال ہوتا ہے۔ خسرو پرویز اور خسرو نوشیرواں۔ یہ دونوں ساسانی بادشاہ تھے۔ لفظ کسریٰ، خسرو ہی کا معرب ہے۔

ایران کی تاریخی روایت کے مطابق اردشیر پاپکاں کا جدِ امجد ساسانی تھا اور اسی مناسبت سے اردشیر پاپکاں کی قائم کردہ سلطنت ساسانی کہلائی۔ اردشیر پاپکاں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، پاپک کا بیٹا تھا اور فارس کی ایک ریاست کا فرمانروا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے تمام ملک میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

ساسانیوں کا عہدِ حکومت ۲۲۶ء سے ۶۵۰ء تک قائم رہا۔ خسرو پرویز، نوشیرواں عادل، بہرام گور اور بہرام چوبیں اسی سلطنت کے مشہور بادشاہ تھے۔ سلطنت ساسان کا آخری بادشاہ یزدجرد ثالث تھا جسے عربوں نے شکست دے کر ایران کو عالمِ اسلام کا حصہ بنایا۔

ساسانیوں ہی کے دور میں صحیفۂ زرتشت کی از سرِ نو تدوین کی گئی تھی۔

تلمیح ۸: آدم وحوّا ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
(نظم "موضوعِ سخن" ص ۸۲)

قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے۔ قرآنی آیات کی روشنی میں پیدائشِ آدمؑ اور ان سے متعلق دوسرے واقعات کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور ان کی پیدائش سے قبل ہی فرشتوں کو آگاہ کر دیا کہ اس کی پیدا شدہ مخلوق "بشر" کہلائیگی اور زمین پر اس کی خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔ حضرت آدم کا خمیر ایسی مٹی سے گوندھا گیا تھا جس میں مختلف النوع تبدیلیوں کو جذب کرنے کی خاصیت تھی۔ جب یہ مٹی سوکھ کر پکی ہوئی ٹھیکری کی طرح کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کے پتلے میں روح پھونکی اور مٹی کا پتلا اچانک گوشت پوست، ہڈی اور پٹھے کا انسان بن گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو ارادہ، شعور، حسن، عقل، وجدانی جذبات وکیفیات سے نوازا۔ اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کے سامنے سربسجود ہو جائیں۔ تمام فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی لیکن ابلیس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کی حیثیت انسان سے افضل ہے کیونکہ وہ آگ سے پیدا کیا گیا تھا اور انسان مٹی سے اور اس کا دعویٰ تھا کہ آگ کی حیثیت مٹی سے ارفع واعلیٰ ہے۔ چنانچہ ابلیس پر خدا کا عتاب نازل ہوا اور وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ لیکن اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ اسے تا قیامت زندہ رہنے کی مہلت عطا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء کے مطابق چونکہ حضرت آدمؑ کو فرشتوں سے افضل وبرتر بنانا تھا تا کہ وہ زمین پر خلافت کے مستحق قرار پائیں اس لئے انھیں صفت 'علم' سے نوازا گیا جس کے ذریعہ کائنات کے تمام اسرار حضرتِ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر کھل سکتے ہیں کچھ عرصہ بعد حضرت آدمؑ کی دلجوئی اور ہمدمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرتِ حوا کو پیدا کیا اور دونوں کو یہ اجازت دی کہ وہ جنت میں رہیں اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں مگر ایک درخت کے بارے میں تاکید کی گئی کہ اس کے قریب تک نہ جائیں۔ اس ممانعت کے پیشِ نظر ابلیس نے حضرت آدمؑ وحوآ کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ شجر ممنوعہ دراصل "شجرِ خلد" ہے اور اس کا پھل کھا کر دونوں نہ صرف انتہائی مسرت محسوس کریں گے بلکہ انھیں قربِ الٰہی بھی نصیب ہوگا۔ ابلیس کے بہکاوے کی وجہ سے آدمؑ وحوآ سے لغزش سرزد ہوئی اور

انھوں نے شجرِ ممنوعہ کے پھل کھا لئے۔ پھل کا کھانا تھا کہ دونوں میں بشری خصوصیات ابھر آئیں اور انہوں نے خود کو ننگا پایا۔ فوری دونوں نے پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانکا اور جب عتابِ الٰہی نازل ہوا تو حضرت آدمؑ و حواؑ نے شرمساری اور ندامت سے اپنی غلطی قبول کی اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے معافی کے خواستگار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف تو کر دیا لیکن یہ حکم بھی صادر کیا کہ اب ان کا قیام بجائے جنت کے زمین پر ہو گا جہاں انھیں اور ان کی اولادوں کو ایک متعین وقت تک قیام کرنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی صراحت بھی کر دی کہ زمین پر آدمؑ کا دشمن ابلیس اپنے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ موجود رہے گا۔ اس طرح آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو ملکوتی اور ابلیسی، دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اگر آدمؑ اور اولادِ آدمؑ ابلیس کی چالوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر ثابت قدم رہیں تو انھیں ان کا اصلی وطن جنت ہمیشہ کے لئے عطا ہو گا۔ یہ حکم سنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدمؑ و حواؑ کو زمین پر اتارا۔

یہاں چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو عام طور پر آدمؑ و حواؑ کے تعلق سے مشہور ہیں۔ قرآنی آیات میں اس بات کی صراحت موجود نہیں کہ حضرت حواؑ، حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ دوم، شجرِ ممنوعہ کے تعلق سے بھی قرآن مجید میں یہ درج نہیں کہ وہ کون سے پھل کا پیڑ تھا۔ صرف ''ایک شجر'' کا تذکرہ ہے۔ سوم، قرآنی آیات کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابلیس نے پہلے حضرت حواؑ کے دل میں شجرِ ممنوعہ کے تعلق سے وسوسہ پیدا کیا تھا اور ان کے ایماء پر حضرت آدمؑ نے اس پیڑ کے پھل چکھے تھے۔ چہارم، قرآن مجید میں حضرت آدمؑ و حواؑ کے بیٹوں کے نام درج نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا باتیں عام طور پر مشہور ہیں اور اسرائیلیات میں بھی ان باتوں کا تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں ''قصص الانبیاء'' میں بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوا ہے جس کی وجہ سے آدمؑ و حواؑ کے تعلق سے کچھ ایسی باتیں بھی عوامی حافظہ کا حصہ بن گئی ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہوا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان باتوں کو بھی درج کر دیا جائے جو عام طور پر حضرت آدمؑ و حواؑ کے تعلق سے مشہور ہیں۔

''قصص الانبیاء'' میں درج ہے کہ خالقِ حقیقی نے تمام موجوداتِ کائنات سے پہلے حضرت محمدؐ کا نور پیدا کیا اور وہ ساری مخلوقات کے پیدا ہونے کا باعث ہیں۔ حضرت آدمؑ سے قبل دنیا میں جن آباد تھے۔ عرصۂ دراز تک ان کی نسل قائم رہی مگر جب وہ سرکشی پر اتر آئے اور زمین پر ظلم کرنے لگے تو

اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل نیست و نابود کر کے زمین کو جنوں کی آلائش سے پاک کیا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کا ارادہ کیا تو ایک فرشتے کو حکم دیا کہ وہ زمین کے ہر خطے سے نرم، سخت، سرخ، سفید، سیاہ غرض ہر قسم کی خاک ایک ایک مٹھی جمع کر لائے۔ جب فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر چکا تو اس مٹی کے خمیر سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا پتلا بنایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے سامنے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے بلا عذر سجدہ کیا لیکن ابلیس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''میں آدم سے بہتر ہوں کیوں کہ مجھے آگ سے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔''

اس نافرمانی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کی صف سے خارج کیا۔ وہ شیطان کے لقب سے مشہور ہوا اور ہمیشہ کے لئے لعنت کا طوق اس کی گردن میں ڈالا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو بہشتی لباس پہنایا اور بہت اعزاز و اکرام سے جنت میں لے گئے۔ جنت میں رہتے ہوئے حضرت آدمؑ کے دل میں ایک رفیق محرم کی خواہش جاگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ان کی بائیں پسلی سے حضرت حواؑ پیدا ہوئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا عقد نکاح انجام دیا اور حکم دیا کہ '' اے آدم و حوا تم دونوں بہشت میں رہو اور یہاں کے سارے میوے کھاؤ'' پھر ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا کہ '' اس کے پاس نہ جاؤ''۔ اسرائیلی عقائد کے مطابق وہ سیب کا درخت تھا۔

شیطان تو حضرت آدمؑ کا دشمن ہو ہی چکا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی کوشش میں رہتا کہ کسی طرح بہشت میں داخل ہو اور حضرت آدمؑ کو وہاں سے نکالے۔ آخر ایک سانپ کی مدد سے ابلیس جنت میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا اور حضرت آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب دی۔ مگر حضرت آدمؑ نے یہ بات قبول نہ کی اور کہا کہ '' مجھ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہرگز نہ ہوگی'' پھر شیطان نے حضرت حواؑ کو اپنی سازش میں پھنسایا جنہوں نے اس کی مسلسل عاجزی کے سبب اس درخت کے پھل خود بھی کھائے اور منت سماجت کر کے حضرت آدمؑ کو بھی کھلائے۔ اس نافرمانی کے سبب حضرت آدمؑ و حواؑ پر قہرِ الٰہی نازل ہوا اور دونوں جنت سے نکالے گئے۔ دونوں کو زمین پر پھینکا گیا۔ حضرت آدمؑ سراندیپ (موجودہ سری لنکا) میں اور حضرت حواؑ جدہ میں گریں۔ '' قصص الانبیاء'' میں لکھا ہے کہ حضرت حواؑ کو خراسان میں پھینکا گیا تھا۔

زمین پر پھینکے جانے کے بعد حضرت آدمؑ مدتِ دراز تک گریہ وزاری اور توبہ و استغفار میں مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور حضرت جبرئیل ان کے پاس آئے اور گناہ معاف کرنے کا

مژدہ سنایا۔ حضرت آدمؑ نے بہت شکر ادا کیا اور عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو کعبے کی تعمیر کا حکم دیا۔ انہوں نے حضرت جبرئیل اور دوسرے فرشتوں کی مدد سے کعبے کی بنیاد رکھی اور حجر اسود کو، جسے وہ بہشت سے اپنے ساتھ لائے تھے، کعبے کی عمارت میں ایک جانب جمایا۔ پھر حضرت جبرئیل نے انھیں حج اور طواف کے طریقے سکھائے۔

اس اثناء میں حضرت حواؑ بھی حضرت آدمؑ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچیں اور مقام ازدلاف پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اسی مناسبت سے اس مقام کو جمع بھی کہتے ہیں۔ حضرت جبرئیل کی مدد سے دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ اور اسی سبب وہ پہاڑیاں، جہاں ان کا تعارف ہوا، عرفات کہلاتی ہیں۔

بعد ازاں حضرت جبرئیل نے تھوڑے بہت گیہوں اور لکڑی بہم پہنچائی اور حضرت آدمؑ کو کاشتکاری سکھائی۔ اسلامی عقائد کے مطابق جب حضرت حواؑ کو حمل رہتا تو ان کے بطن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ساتھ ساتھ پیدا ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی شریعت میں مقرر کر دیا تھا کہ ایک حمل کا بیٹا دوسرے حمل کی بیٹی سے بیاہا جائے۔ اس طرح بنی آدم کی نسل چلی۔

تلمیح ۹ : کلثوم

کلثوم کے نام

(انتساب، ص ۳)

اردو کے قابلِ قدر شاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے ایک برطانوی نژاد خاتون سے شادی کی تھی۔ اس برطانوی خاتون کی چھوٹی بہن ایلس جارج جب ۱۹۳۸ء میں اپنی بہن سے ملنے ہندوستان آئی تو اس کی ملاقات فیض احمد فیض سے امرتسر میں ہوئی۔ دونوں میں عشق ہوا اور دو سال بعد دونوں نے شادی کر لی۔ نکاح سرینگر میں ہوا جہاں مہاراجہ کشمیر نے اپنا گرمیوں کا محل انھیں نکاح کی رسم انجام کرنے کے لئے دیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے نکاح کی رسم ادا کی تھی۔ بارات لاہور سے آئی تھی جس میں صرف تین افراد شامل تھے۔ ایک فیض، دوسرے ان کے بڑے بھائی اور تیسرے فیض کے دوست نعیم۔ نکاح کے بعد فیض اور ایلس فیض نے شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر محفلِ مشاعرہ کا اہتمام ہوا جس میں مجاز اور جوش نے بھی شرکت کی تھی۔

کشمیر میں تین دن قیام کر کے فیض اور ایلس فیض لاہور گئے جہاں دعوتِ ولیمہ کی گئی۔ ایلس نے بالکل مشرقی دلہن کی طرح گھونگٹ نکال کر اور سر جھکا کر اپنی ساس کی بزرگانہ دعائیں لیں۔ فیض کی والدہ ہی نے ایلس کا اسلامی نام کلثوم تجویز کیا تھا اور اسی مناسبت سے فیض نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام ''دستِ صبا'' کا انتساب ''کلثوم کے نام'' یعنی اپنی رفیقۂ حیات کے نام کیا ہے۔

تلمیح ۱۰ : حافظ ؒ

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

''دستِ صبا'' کے صفحہ ۹ پر فیض نے حافظ شیرازی کا درج بالا شعر نقل کیا ہے۔ شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ بادِ صبا کا جھونکا مشک چھڑکنے والا ہو جائے گا اور یہ جو بوڑھی دنیا ہے پھر سے جوان ہو جائیگی۔

حافظ کا شمار فارسی کے عظیم ترین شعراء میں ہوتا ہے اور جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے حافظ کو اس صنف کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ان کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔ شبلی نعمانی نے عبدالنبی فخر الزمانی کے تذکرے ''میخانہ'' کو سامنے رکھ کر جو

حالات لکھے ہیں ان سے حافظؔ کے بچپن کے چند واقعات کا علم تو ہوتا ہے لیکن ان کی تاریخِ پیدائش، استادوں کے نام اور تعلیم و تربیت کی باضابطہ تفصیل نہیں ملتی۔ حالیہ تحقیق کے مطابق محمد شمس الدین حافظ ۱۳۲۵ء میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔

خواجہ حافظ شیرازی کا آبائی وطن اصفہان تھا۔ انکے دادا ہجرت کر کے شیراز میں آ بسے تھے۔ حافظؔ کے والد کا نام بہاء الدین تھا جو تجارت پیشہ تھے اور اپنے وقت کے متمول لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے جن میں حافظ سب سے چھوٹے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد حافظؔ کے بھائیوں نے سارا اثاثہ بہت کم عرصہ میں صرف کر ڈالا اور اپنی والدہ اور کمسن حافظؔ کو پریشان حال چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ حافظؔ کی والدہ نے بڑے نامساعد حالات میں جیسے تیسے ان کی پرورش کی۔

جب حافظؔ سن شعور کو پہنچے تو خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا لیکن تعلیم حاصل کرنے کا شوق شروع ہی سے ان کے دل میں تھا۔ اپنے پیشہ میں دن رات محنت کر کے کسی قدر آمدنی میں اضافہ کیا اور مکتب میں داخلہ لیا۔ قرآنِ مجید حفظ کیا پھر شیراز کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی۔ بجائے شہرت کے بدنامی مول لی کیونکہ ابتداء میں نہ تو موزوں شعر کہہ سکتے تھے اور نہ ہی کوئی نیا مضمون اختراع کر سکتے تھے۔ لوگ ان کا کلام سنتے اور مذاق اڑاتے۔ انھیں بھی اپنی مہمل اور بے سروپا شاعری کا احساس ہوا۔ روایت ہے کہ ایک دن بڑے افسردہ حال ہو کر باباکوہی کے مزار پر پہنچے، اور بڑی رقّت کی حالت میں ان سے مدد چاہی۔ اسی رات خواب دیکھا کہ ایک بزرگ انھیں ایک لقمہ کھلا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ" جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔" صبح اٹھے تو ایک معیاری غزل کہی جس کا مطلع ہے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
دندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

اس کے بعد جب اہل شیراز نے انھیں چھیڑتے ہوئے کلام خوانی کی فرمائش کی تو انہوں نے وہی غزل پیش کی۔ پہلے تو لوگوں کو یقین نہ آیا کہ حافظؔ اتنی عمدہ غزل کہہ سکتے ہیں۔ پھر کئی طریقوں سے ان کا امتحان لیا گیا اور ہر مرتبہ حافظ نے معیاری کلام پیش کیا۔ اس طرح بطورِ شاعر ان کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی اور سلاطین اور امراء کی جانب سے پیامات آنے شروع ہوئے۔

اس زمانے میں فارس اور شیراز پر شاہ ابو اسحاق کی حکمرانی تھی جس کا تعلق غازاں خاں کے خاندان سے تھا۔ وہ خود ایک اچھا شاعر اور انتہائی عیش پرست شخص تھا۔ اس نے حافظؔ کی قدردانی میں

کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور حافظ کی رندانہ و مستانہ غزلیں اس دور میں بے انتہا مقبول ہوئیں۔ تاہم شاہ ابو اسحاق کی عیش پسندی کی وجہ سے ملک میں بد انتظامی پھیل چکی تھی۔ اس لئے ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں شاہ محمد مظفر نے شیراز فتح کر کے ابو اسحاق کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد محمد بن مظفر شیراز و فارس کا حکمراں مقرر ہوا۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار شخص تھا۔ اس نے شراب بندی کا حکم جاری کیا اور حافظ پر پریشانیوں کا وقت آن پڑا۔ پھر جب شاہ شجاع شیراز کا فرمانروا بنا تو میخانے دوبارہ کھل گئے۔ جس کے لئے حافظ نے کئی غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھیں۔ شروع میں شاہ شجاع نے حافظ کی بہت پذیرائی کی لیکن بعد ازاں فقہا اور علماء کے بہکانے پر ان سے خفا رہنے لگا۔ ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) میں شاہ شجاع کا انتقال ہوا اور اسکے بعد منصور بن محمد مظفر شیراز کا حکمراں بنا۔ اس کے دورِ حکومت میں تیمور نے شیراز پر حملہ کیا۔ منصور نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ میدانِ جنگ ہی میں اسے قتل کیا گیا۔ شیراز پر قابض ہونے کے بعد تیمور نے حافظ کو طلب کیا اور ان کے ایک مشہور شعر۔

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کے تعلق سے ان سے باز پرس کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو، کہ میرا وطن ہے، آباد کروں۔ تم ان کو ایک تِل کے عوض میں دے ڈالتے ہو۔"

حافظ نے جواب دیا کہ "انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی ہے۔" (شبلی نعمانی، شعر العجم ص ص ۱۹۸، ۱۹۹)

تیمور، حافظ کی اس بذلہ سنجی سے کافی محظوظ ہوا اور انھیں کسی طرح کی سزا نہیں دی۔

حافظ کی کمالِ شاعری کی شہرت جب ایران کی سرحدیں پار کر کے دور دراز کے ملکوں میں پھیل گئی تو کئی حکمرانوں کی جانب سے دعوت نامے آنے شروع ہوئے۔ بغداد کے فرمانروا سلطان احمد بن اویس نے انھیں بارہا بلایا لیکن حافظ سے اپنا وطن نہ چھوٹا۔ اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت قائم تھی اور سلطان محمود حاکمِ وقت تھا۔ اس نے دعوت نامہ بھیجا۔ حافظ نے رختِ سفر باندھا اور جہاز میں سوار بھی ہو گئے لیکن جہاز کا لنگر اٹھنے سے قبل ہی طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور انھوں نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

حافظ نے ۷۹۳ھ (۱۳۸۹ء کے آس پاس) میں انتقال کیا۔ شیراز کے مضافات میں مصلے

نامی ایک مقام ہے جو حافظ کو بہت پسند تھا لہٰذا وہیں تدفین عمل میں آئی۔ بعد ازاں اس مقام کا نام حافظیہ ہو گیا۔

تلمیح ۱۱ : مہاتما گاندھی

"سیاسی لیڈر کے نام" (نظم، ص ۱۵)

فیضؔ نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے نظم "سیاسی لیڈر کے نام" گاندھی جی کے لئے لکھی تھی۔ تاہم ۱۴ مصرعوں کی اس مختصر نظم میں کہیں اس بات کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ یہ نظم گاندھی جی کے متعلق ہو سکتی ہے۔ کلیات میں نظم کا سنہ تخلیق بھی نہیں دیا گیا ہے کہ اسے ہی بنیاد بنا کر یہ کوشش کی جاتی کہ یہ نظم گاندھی جی کی زندگی کے کس واقعے یا ان کے نظریات کے کس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

نظم کے پہلے آٹھ مصرعوں میں تو فیضؔ نے مجاہدین آزادی کے بلند حوصلوں، ان کی ثابت قدمی اور ان کے جذبۂ حریّت کا قصیدہ نظم کیا ہے اور یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ اب تاریکی (بمعنی برطانوی استبداد) کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور آزادی کا سورج بہت جلد طلوع ہونے والا ہے۔ نویں مصرعے سے وہ سیاسی لیڈر (گاندھی جی؟) سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تیرا کل سرمایہ یا تیری قیادت کی بنیاد دراصل مجاہدینِ آزادی کا جذبہ عمل ہے ع

تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں

اور آزادی کے دیوانوں کی قوتِ بازو (عسکریت؟) کو استعمال کرنے کے سوا تیرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جس پر چل کر تو آزادی کی نعمت پا سکتا ہے۔ تو جو خود ظلمت (غلامی) کے خلاف ہے لیکن تجھے یہ بھی منظور ہے کہ مجاہدین آزادی اپنے بازوؤں کی قوت یا اپنے ہاتھوں کا استعمال نہ کریں۔ تیری اس حکمتِ عملی سے تو یہی ہو گا کہ آزادی کا دن غلامی کی میت کے تلے دب جائے گا۔

چونکہ فیضؔ نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ نظم گاندھی جی کے لئے لکھی تھی اس لئے کھینچ تان کر نظم کے آخری چھ مصرعوں کی تاویل یہ ہو گی کہ فیضؔ گاندھی جی کے نظریۂ عدم تشدد سے متفق نہیں تھے۔ اگر اس تاویل پر اعتبار کیا جا سکے تو یہ کہنا ہو گا کہ فیضؔ نے گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا۔ عدم تشدد کے تعلق سے دو رائیں ہو سکتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ یہ ایک آدرش ہے جس

کا اطلاق ہر تحریک حریت پر نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدد کا سوال ہے تو یہ بات پورے ایقان سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ بے عملی اور بزدلی کی تبلیغ نہیں کرتا بلکہ تشدد کے احمقانہ یا بے سمت استعمال کی نفی کرتا ہے۔ بقول فیض یہ نظم گاندھی جی سے متعلق ہے اس لئے ضروری ہے کہ گاندھی جی کے حالات اور ان کے نظریہ عدم تشدد کی صراحت کی جائے۔

موہن داس کرم چند گاندھی ۲ راکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی ریاست میں دیوان تھے۔ گاندھی جی کی ذات ویش تھی اور اس ذات سے تعلق رکھنے والے افراد ہندو روایات کے پیش نظر تجارت پیشہ ہوتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی کے پتا ملازم پیشہ تھے۔ ۱۳ برس کی عمر میں ان کی شادی کستورا بائی سے کر دی گئی جو بالکل ناخواندہ تھیں۔ اس کے چار سال بعد گاندھی جی کے پتا کا انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی کو قانون کی تعلیم کی تحصیل کے لئے انگلستان روانہ کیا گیا تا کہ وہ کسی ریاست میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو سکیں۔ گاندھی جی کا خاندان چونکہ بے انتہا مذہبی تھا اس لئے انھیں انگلستان روانہ کرنے کا فیصلہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن حالات کے پیشِ نظر ان کے افرادِ خاندان نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ گاندھی جی سے قبل ان کے خاندان کا کوئی فرد ملک سے باہر نہیں گیا تھا۔ ویش ذات کے ہندوؤں نے فوری گاندھی جی کو ذات باہر کر دیا۔

قانون کی تعلیم مکمل کر کے گاندھی جی ہندوستان لوٹے اور ممبئی کی عدالتوں میں وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان کی وکالت بالکل نہ چلی۔ پھر انھیں جنوبی افریقہ سے اپنے ایک رشتہ دار کا پیغام موصول ہوا کہ ایک مقدمے کی پیروی کے لئے جنوبی افریقہ تشریف لائیں۔ گاندھی جی یہ سوچ کر جنوبی افریقہ روانہ ہوئے کہ چند مہینوں تک مقدمے کی پیروی کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ آئیں گے لیکن حالات نے انھیں وہاں ۲۵ برسوں تک قیام کرنے پر مجبور کیا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت کے نسلی تعصب کی وجہ سے گاندھی جی کے نظریات میں زبردست تغیر آیا جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ نے بھی نیا موڑ لیا۔

گاندھی جی کی جنوبی افریقہ میں آمد کے ایک ہفتہ بعد وہ تاریخ ساز واقعہ رونما ہوا جس نے ان کی زندگی کا مقصد ہی بدل دیا۔ ڈربن سے پریٹوریا جانے کے لئے جب وہ ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں سوار ہوئے تو بیچ سفر میں انھیں میریٹز برگ اسٹیشن پر مع ساز و سامان ڈبے سے باہر پھینک دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ جنوبی افریقہ کے نسلی قوانین کی رو سے کوئی غیر سفید فام شخص فرسٹ کلاس ڈبے میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس یخ بستہ اور اندھیری رات میں ایک ویران اور چھوٹے سے پلیٹ فارم پر

گاندھی جی نے پہلی دفعہ نسلی عصبیت کا مکروہ اور ہیبت ناک چہرہ دیکھا تھا۔ وہیں انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس غیر انسانی نظامِ حکومت کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد گاندھی جی نے پہلی بار پریٹوریا میں ہندوستانیوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانیوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر متحد ہونا چاہئے، اور ظالموں سے برسرِ پیکار ہونے کیلئے ظالموں کی زبان یعنی انگریزی سیکھنی چاہئے۔ دوسرے ہی دن سے انہوں نے انگریزی سے نابلد ہندستانیوں کو انگریزی پڑھانے کے کام کا آغاز کیا۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نے غیر سفید فام افراد کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے ۲۵ برسوں تک کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس دوران ان کی شہرت ہندوستان اور برطانیہ میں پھیل گئی۔ جنوبی افریقہ میں اپنے قیام کے دوران گاندھی جی نے رسکن، ٹالسٹائی اور تھورو کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جس کے باعث ان کے نظریات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جب وہ ۹ر جنوری ۱۹۱۵ء کو بمبئی کی بندرگاہ پر اترے تو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو وہ قائد مل گیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہندوستان میں اپنی آمد کے بعد، تقریباً ایک برس تک، گاندھی جی نے پورے ملک کا دورہ کیا اور ہندوستانی عوام کی مفلسی، ناخواندگی اور پچھڑے پن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے ملک کے حقیقی مسائل سے واقف ہونے کے بعد انھوں نے تحریکِ آزادی کو ایک نئی سمت دی جس کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس کے کردار میں بھی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ گاندھی جی کے ہندوستانی سیاسی افق پر نمودار ہونے سے قبل یہ انجمن بڑی حد تک ہندوستانی تعلیم یافتہ اور مراعات یافتہ افراد کا پلیٹ فارم تھی۔ گاندھی جی نے اسے عوامی تحریک میں تبدیل کردیا۔ گاندھی جی دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کا خاتمہ کرنے کا عزم لے کر اٹھے تھے لیکن اس طاقت سے ٹکر لینے کے لئے ان کے ہاتھوں میں نہ تو بندوق تھی نہ تلوار۔ صرف حق وانصاف کا علم تھا۔

برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہونے کے لئے گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو دو بے انتہا طاقتور ہتھیار دیئے۔ ستیہ گرہ اور اہنسا۔ ان کے نزدیک حق کی طاقت ہی سب سے بڑی طاقت تھی اور عدم تشدد کے راستے پر گامزن رہنا ایک بے خوف اور بہادر فرد کا فریضہ۔ ستیہ گرہ اور اہنسا کے طریقہ کار کو گاندھی جی نے انگریزی سرکار کے خلاف ہر کڑے وقت میں آزمایا اور اکثر مواقع پر کامیاب رہے۔ ۱۹۱۵ء سے ہندوستان کو آزادی ملنے تک برصغیر کی تاریخ دراصل گاندھی جی اور ان کے اصولوں کی کرشمہ سازی کی تاریخ ہے۔

بقول فیضؔ ان کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' گاندھی جی سے معنون ہے اور نظم کا ایک مصرعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر سیاسی قائد کے نظریہ عدم تشدّد سے اختلاف اس لئے رکھتا ہے کہ اگر مجاہدین حریت اپنے بازوؤں کی قوت کا استعمال نہیں کریں گے تو قائد کا تمام سرمایہ ہی لٹ جائیگا اور ایسی قیادت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں فیضؔ نے گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدّد کے ادراک میں غلطی کی اسلئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس نظریے کی صراحت کی جائے۔

گاندھی جی مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تمام مذاہب محبت اور عدم تشدّد کی تعلیم دیتے ہیں۔ گاندھی جی اس بات پر ایقان رکھتے تھے کہ انسانی تاریخ کا سفر حق اور عدم تشدّد کی منازل کی طرف جاری ہے۔ اسی ایقان کی روشنی میں گاندھی جی نے اپنے نظریۂ عدم تشدّد کے خدوخال مقرر کئے تھے۔ جو اس طرح ہیں:

۱) عدم تشدّد انسانی معاشرے کا کلیدی قانون ہے جو جبر و استبداد اور تشدّد کے قوانین سے بدرجہا بہتر ہے۔

۲) عدم تشدّد کی اساس انسانوں سے محبت کرنے کے جذبے پر قائم ہے۔

۳) عدم تشدّد کے ذریعہ ایک فرد اپنی عزت وحمیت کی بخوبی حفاظت کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ حق پر ہو۔

۴) جو افراد و اقوام عدم تشدّد کے نظریے پر کاربند رہنے کا تہیہ کرتے ہیں انہیں سوائے اپنی عزت و حمیت کے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

۵) عدم تشدّد ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا استعمال بچے، جوان، بوڑھے، مرد و زن بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ انسان اور انسانیت سے محبت کرتے ہوں۔

۶) عدم تشدّد کے تعلق سے ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ اس حکمتِ عملی پر صرف مراعات یافتہ افراد قائم رہ سکتے ہیں یا عوام اس اصول پر بجا طور پر کاربند نہیں رہ سکتے۔

نظریہ عدم تشدّد گاندھی ازم کا بنیادی اصول ہے اور گاندھی جی نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اس کا استعمال ہندوستانی معاشرے کی تاریخ اور ہندوستانیوں کے مزاج کے پیشِ نظر کیا تھا۔ وہ صرف ایک سیاسی قائد ہی نہیں بلکہ نباضِ قوم تھے اور انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ مسلح بغاوت کا اصول ہندوستانیوں کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اور نہ ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کی مثال ملتی ہے۔

تلمیح ۱۲: مسیحا

نغمہ جرّاح نہیں، مونسِ و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں

(نظم 'مرے ہمدم، مرے دوست' کا آخری بند، ص ۱۹)

گو اس بند میں لفظ 'مسیحا' بطور استعارہ استعمال ہوا ہے یعنی ایسا فرد یا ایسی شئے جس کے ذریعہ شفا یا آزار سے نجات کی صورت نکلے۔ نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی اکثر زبانوں میں لفظ مسیحا کا استعمال بمعنی نجات دہندہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو کئی معجزے عطا کئے تھے جن کے ذریعہ وہ لوگوں کو آلام و آزار سے نجات دلاتے تھے۔ اسلئے یہاں بھی مسیحا کی تلمیح حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شمار انتہائی جلیل القدر پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تعلیمات کو ماننے والے ان کے نام کی نسبت ہی سے عیسائی کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کو مسیح اور عبداللہ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ 'مسیحا' لفظ مسیح کا مفرّس ہے۔

اسلامی عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش منجملہ اسرارِ تخلیق ہے۔ ان کی والدہ حضرت مریم بنی اسرائیل کے ایک معروف سردار عمران کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ حضرت عیسیٰ بیت اللحم (جو بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں ہے) میں پیدا ہوئے۔ حضرت مریمؑ کو پہلے ہی سے یہ خدشہ تھا کہ لوگ ان کے بچے کے تعلق سے استفسار ضرور کریں گے۔ اور جب لوگوں نے ایسا کیا تو حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ خدا کی قدرت سے نومولود حضرت عیسیٰؑ اسی وقت بول اٹھے کہ "میں خدا کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبوت عطا کی ہے۔" یہ معجزہ دیکھ کر بنی اسرائیل انھیں بیت المقدس لے آئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مریمؑ انھیں ساتھ لے کر مصر چلی گئیں اور بارہ برس تک وہیں رہیں۔ اس کے بعد شام جاکر ناصرہ میں قیام کیا۔ حضرت عیسیٰؑ قریب تیس برس کی عمر تک وہیں مقیم رہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل

فرمائی اور ان کو خلقِ خدا کی رہبری پر مامور کیا اور کتاب انجیل عنایت کی۔

اسلامی عقیدے کے مطابق جب حضرت عیسیٰؑ کی عمر قریب تیس برس کی ہوئی تو وہ نہر اردن کی طرف گئے جس کو شریعہ بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں لوگوں کی ہدایت کر کے خدا کی طرف متوجہ کیا۔ اسی نہر میں پیغمبر خدا حضرت یحییٰ علیہ السلام نے دستور کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غوطہ دے کر اپنے مریدوں میں داخل کیا۔ اس وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وفات کا زمانہ قریب تھا۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام وعظ و نصیحت میں مصروف ہوئے تو انہوں نے اپنی نبوت کی تصدیق کے لئے لوگوں کو معجزے دکھائے۔ چنانچہ مردے کو زندہ کرنا، مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں روح پھونکنا، اندھوں اور جذامیوں کو شفا دینا، پانی پر چلنا، وہ اہم معجزات تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کئے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اہم مصاحب اور مددگار بارہ آدمی تھے جو حواری کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے اور ان کی تعلیمات پر عمل کرتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دن دورانِ وعظ و نصیحت یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے توریت میں ظاہر کیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو سنیچر کا دن مبارک ہے۔ اس دن سوائے عبادت کے دنیوی کام کرنا حرام ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس دن کو منسوخ کیا اور ہماری کتاب انجیل میں فرمایا کہ اتوار کا دن بہت مبارک ہے۔ تو اب اتوار کے دن سوائے عبادت کے اور کوئی کام نہ کرنا، جب بنی اسرائیل نے یہ سنا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان کے دشمن ہو گئے اور کہنے لگے کہ ایک بے پدر لڑکا کس طرح حضرت موسیٰؑ کی شریعت کو منسوخ کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں کے سردار کو بھی اپنے دین کی ہدایت کی مگر وہ ایک ظالم اور سرکش قسم کا انسان تھا۔ وہ بجائے راہِ راست پر آنے کے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کو لے کر ایک مکان (جس کا نام عین السلوک آیا ہے) میں مقیم ہوئے۔ یہودیوں نے اس مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا اور وہ حضرت عیسیٰؑ کو اپنے ساتھ چوتھے آسمان پر لے گئے۔ انجیل کی رو سے جب حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے ساتھ روپوش ہوئے تو ان کا ایک حواری جس کا نام یہودا اسقر یوطی تھا غدار نکلا اور اس نے یہودیوں کے حاکم کے پاس جا کر کہا ''اگر میں عیسیٰؑ کا پتہ بتا دوں تو مجھے کیا انعام دو گے؟'' حاکم نے کہا ''تیس درہم'' یہودا راضی ہو گیا اور اس نے تیس درہم لے کر حضرت عیسیٰؑ کا پتہ بتا دیا۔

اسلامی عقیدے کے مطابق جس شخص کو سولی پر چڑھایا گیا تھا وہ درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نہیں تھے کیونکہ انھیں پہلے ہی جبرئیل اپنے ساتھ چوتھے آسمان پر اٹھا لے گئے تھے۔ سولی پر چڑھائے جانے والا شخص دراصل یہودیوں کا سردار شیوع تھا جس کی صورت خدا کی مرضی و منشاء سے بعینہٖ حضرت عیسیٰؑ جیسی ہوگئی تھی۔ اس طرح اہل اسلام کی رو سے حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے اور وہ دوبارہ زمین پر آئیں گے۔ جب قیامت کے آثار نظر آنے لگیں گے تو اول نصاریٰ کا ستارۂ قسمت عروج پر ہوگا۔ پھر امام مہدی کی پیدائش ہوگی اور وہ اسلام کی ترقی و ترویج میں بہت نمایاں کردار ادا کریں گے۔ پھر ایک دجّال نامی کافر طرح طرح کے مکر و فریب سے لوگوں کو کفر کی ترغیب دے گا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتر کر دینِ محمدیؐ میں شامل ہونگے اور حضرت امام مہدی کے ساتھ مل کر دجّال اور اس کے پیروکاروں کا خاتمہ کر کے اسلام کو پھیلانے کا کام کریں گے حتیٰ کہ تمام لوگ اسلام کا دامن تھام لیں گے۔ پھر کچھ عرصہ بعد قیامت کا ہنگامہ برپا ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ کے تعلق سے اہل اسلام اور عیسائیوں کے عقائد میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائی انھیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں جبکہ مسلمان انھیں اللہ تعالیٰ کا ایک جلیل القدر نبی سمجھتے ہیں۔ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تمام معلومات کا سرچشمہ متی (Mathew) لوقا (Luke)، مرقس (Mark) اور یوحنا (John) کی لکھی ہوئی انجیلیں ہیں جو مجموعی طور پر نیا عہد نامہ کہلاتی ہیں۔ یہ انجیلیں پہلی صدی عیسوی کی چھٹی دہائی میں لکھی گئی تھیں۔ نئے عہد نامے کے مطابق حضرت مریم ناظرہ کے ایک بڑھئی یوسف کی بیوی تھیں۔ رومی قانون کے مطابق جب حضرت مریم اور یوسف اعداد و شماری میں اپنے ناموں کا اندراج کرانے بیت اللحم گئے تھے تو معجزاتی طور پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی تھی۔ نئے عہد نامے میں حضرت عیسیٰؑ کی بارہ برس کی عمر سے لے کر تیس برس کی عمر کے حالاتِ زندگی کا قطعی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تیس برس کی عمر میں یوحنا نے حضرت عیسیٰؑ کو دریائے اردن میں غوطہ دے کر ان کا بپتسمہ (اصطباغ) کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ جنگل میں مراقبہ کے لئے چلے گئے جو چالیس دنوں تک جاری رہا۔ پھر وہ پہلے جلیل (Galilee) گئے اور اس کے بعد اپنے وطن ناظرہ کی راہ لی۔ جب انہوں نے ناظرہ میں اپنے دین کی تبلیغ شروع کی تو ان کے ہم وطنوں نے ان کی مخالفت کی۔ اس لئے وہ کیپر نام (Capernam) منتقل ہوئے اور وہاں تبلیغ شروع کی۔ جب کیپر نام میں ان کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے ان میں سے اپنے بارہ انتہائی وفادار ساتھیوں کو منتخب کیا جو حواری کہلائے۔ ان کو ساتھ لیکر حضرت عیسیٰؑ نے اطراف و اکناف کے

علاقوں میں وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی دوران انہوں نے وہ معجزات بھی دکھائے جو انھیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیئے تھے۔

حضرت عیسیٰ کے آخری ایام کے تعلق سے اہل اسلام اور عیسائیوں کے عقائد میں کافی فرق ہے۔ نئے عہد نامے کے مطابق حضرت عیسیٰ کی زندگی کے آخری کچھ سات دنوں کا ذکر بڑی صراحت سے ہوا ہے۔ اتوار کو حضرت عیسیٰ یروشلم میں داخل ہوئے جہاں عوام نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ پیر اور منگل کے دنوں میں انہوں نے عبادت گاہ کو تاجروں اور سودخوروں سے پاک کیا۔ یہودی روایات کے پیش نظر یہ افراد عبادت گاہوں میں بھی اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اس بات پر انہیں یہودی پیشواؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ منگل کے دن انہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مصلوب ہوں گے لیکن پھر جی اٹھیں گے۔ بدھ کے دن بطنی (Bathany) مقام پر ایک عورت نے ان کے سر کی مالش ایک قیمتی تیل سے کی۔ حضرت عیسیٰ نے اس کی تشریح یوں کی کہ ان کی تجہیز و تکفین کا وقت آچکا ہے۔ بدھ کے دن ہی یروشلم کے یہودیوں نے ان کے ایک حواری یہودا اسقریوطی (Judas Iscariot) سے مل کر یہ سازش کی کہ وہ حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے میں ان کی مدد کرے۔ جمعرات کی رات کو حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کے ساتھ آخری عشائیہ (The Last Supper) تناول کرتے وقت اپنے مصلوب ہونے اور اپنے ایک حواری کی غداری کا ذکر کیا تھا۔ عشائیہ کے بعد حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری کوہ زیتون پر چلے گئے اور وہاں عبادت میں مشغول ہوئے۔ یہودیوں نے یہودا اسقریوطی کے ساتھ ایک جم غفیر کو انھیں گرفتار کرنے کے لئے روانہ کیا اور وہ بالآخر گرفتار ہوئے۔

گرفتاری کے بعد حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کیا گیا جہاں ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وہ خود کو خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں۔ جب انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو ان پر کفر کا الزام دھر کر ان کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی تھی۔ لیکن بنی اسرائیل کا علاقہ رومیوں کی کالونی تھا اور اقتدار اعلیٰ رومیوں کے ہاتھوں میں تھا اسلئے کسی فرد کو سزائے موت دینے کا اختیار صرف رومی گورنر کو تھا۔ اسلئے جمعہ کی صبح کو یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو رومی گورنر بونطیئس بلاطی (Pontius Pilate) کے سامنے پیش کیا۔ بلاطی چونکہ یہودی نہیں تھا اسلئے اسے یہودیوں کے نقطۂ نظر یا حضرت عیسیٰ کے دین سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن یہودیوں کے اصرار پر اس نے انھیں سزائے موت سنائی۔

اس زمانے کے قانون کے مطابق انہیں مصلوب کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی دو پیشہ ور رہزنوں کو بھی مصلوب کیا گیا تھا۔ شام کے وقت حضرت عیسیٰ کی نعش کو صلیب سے اتارا گیا۔ یہودی عقائد کے مطابق سنیچر کے روز لاش کی تدفین فعل نامبارک سمجھی جاتی ہے اسلئے نعش کو ایک قریبی مقبرے میں رکھا گیا۔ اتوار کے دن جب دو عیسائی خواتین ان کی نعش کی تدفین کے سلسلے میں مقبرہ پہنچیں تو انہیں نعش کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اس کے بعد ایک زلزلہ آیا اور حضرت عیسیٰ ان دونوں خواتین اور اپنے پیروکاروں کو مختلف جگہوں پر دکھائی دیئے اور یہ مژدہ سنایا کہ وہ زمین پر دوبارہ آئیں گے اور حکومتِ الٰہی کو قائم کریں گے۔

تلمیح ۱۳ : صبحِ آزادی

(نظم ''صبحِ آزادی'' اگست ۱۹۴۷ء، ص ۲۰)

اگر تاریخِ عالم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے۔ بعض اہم تاریخی واقعات کے اسباب انتہائی معمولی تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور بالآخر ہندوستان کی غلامی کا سبب بھی بہت معمولی قسم کا تھا۔

برصغیر ہند اور بحرِ ہند کے جزائر زمانہ قدیم سے پکوان میں استعمال ہونے والے مسالوں خصوصاً گرم مسالوں کے لئے کافی شہرت رکھتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے ممالک میں ان مسالوں کی بہت مانگ تھی۔ مسالوں کو یورپی ممالک کی منڈیوں تک پہنچانے کا کاروبار پہلے عرب تاجروں کے ہاتھوں میں تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد اس کاروبار پر یوروپی تاجروں کا قبضہ ہوگیا۔ ہندوستان سے مسالوں کی برآمدات کا کاروبار زیادہ تر ہالینڈ کے تاجروں کے ہاتھوں میں تھا جو دوسرے یورپی ممالک کے علاوہ برطانیہ کو بھی یہ مسالے فراہم کرتے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہالینڈ کے تاجروں نے سیاہ مرچ کے نرخ میں معمولی سا اضافہ کیا یعنی اس کی قیمت فی پونڈ (تقریباً آدھ سیر) پر پانچ شلنگ بڑھادی۔

ہالینڈ کے تاجروں کے اس معمولی کاروباری فیصلے کے ردعمل میں لندن کے ۲۴ تاجر ۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء کو لیڈن ہال اسٹریٹ میں واقع ایک خستہ حال عمارت میں مجتمع ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان سے مسالوں کو درآمد کرنے کا کاروبار برطانوی تاجروں کو خود کرنا چاہئے۔ اس طرح ۱۲۵ حصہ داروں کی شراکت سے ۷۲ ہزار پونڈ کا سرمایہ مہیا کیا گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد

پڑی۔

۳۱ر دسمبر ۱۵۹۹ء کو ملکہ ایلزبتھ اوّل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلق سے ایک شاہی فرمان جاری کر کے اسے مشرقی ممالک میں درآمد و برآمد کرنے کا قانونی حق عطا کیا۔ اس کے آٹھ مہینوں بعد ہیکٹر (Hector) نامی ایک برطانوی جہاز سورت کی بندرگاہ میں ۲۴ر اگست ۱۶۰۰ء کو لنگر انداز ہوا۔ اس طرح انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے۔

برطانوی جہاز کا کپتان ولیم ہاکنس تاجر یا کپتان ہونے سے زیادہ ایک قزاق تھا۔ جب وہ آگرہ پہنچا تو جہانگیر نے اس کی بہت پذیرائی کی اور انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے تجارتی اڈے قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

جب تک مغلیہ سلطنت کا جاہ و جلال برقرار رہا تب تک انگریزوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں براہ راست مداخلت کرنے سے پرہیز کیا۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد جب مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور مختلف صوبجات کے راجے اور نواب تقریباً خود مختار بن بیٹھے تو آہستہ آہستہ انگریزوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کی۔

اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سال بعد ۲۳ر جون ۱۷۵۷ء کو لارڈ کلائیو نے بنگال میں پلاسی کے مقام پر نواب سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس کے بعد ایک تجارتی کمپنی نے پورے برصغیر پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کیلئے مختلف حربے آزمانے شروع کئے۔ آئندہ سو برسوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو حیرت انگیز کامیابیاں نصیب ہوئیں اور ۱۸۵۷ء کے آتے آتے پورے ملک پر عملاً انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی عملداری لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس افسوسناک صورتحال کے ردِّ عمل میں ہندوستانی قوم پرست سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جسے انگریز مورخین غدر اور ہندستانی مورخین پہلی جنگِ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندوستانی سپاہیوں میں جوش زیادہ تھا، فوجی حکمتِ عملی کم تھی۔ انگریزوں نے سکھوں کی مدد سے اس ہنگامے پر قابو پایا۔ جب دہلی پر ان کا قبضہ ہوگیا تو ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے گئے کہ وہ آئندہ سو برسوں تک سنبھل نہ سکے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ایک اہم سیاسی تبدیلی رونما ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیاسی اقتدار ختم ہوا اور ہندوستان براہ راست برطانیہ کی نو آبادی قرار دیا گیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور بالآخر سیاسی اقتدار پر ان کے تسلط نے جہاں

ہندوستانیوں کو محکوم و مفلوج بنادیا تھا وہیں چند مثبت پہلوؤں کو بھی جنم دیا۔ انگریزوں کی آمد سے ہماری تاریخ کے جدید دور کی ابتدا ہوئی ۔ انگریزوں نے اپنے ساتھ کئی ایسی سائنسی ایجادات لائی تھیں جن سے مشرق ناواقف تھا۔ ہندوستان میں جب ریل اور ٹیلی گراف جیسی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں تو ان کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے کے تقریباً ہر شعبے پر بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ فوری طور پر تو ہندوستان جیسا برصغیر سفر کی سہولتوں اور ذرائع ابلاغ کی بہتری کی وجہ سے، ان معنوں میں سکڑ گیا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے یا اطلاعات بہم پہنچانے کی دشواری تقریباً ختم ہوگئی ۔ ان وسائل کی وجہ سے ہندوستان نے صحیح معنوں میں ایک جغرافیائی وحدت کی شکل اختیار کرلی ۔ برطانوی حکمرانوں نے ملک میں ایک متجانس (homogeneous) سیاسی، انتظامی اور عدلی نظام قائم کیا۔ انگریزی تعلیم کے رائج ہونے سے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی مصلحین نے مغربی نظریات وعقائد کی روشنی میں ہندوستانی معاشرے اور مذاہب کی اصلاح کے لئے تحریکیں شروع کیں۔ یہ سلسلہ راجہ رام موہن رائے سے شروع ہوکر پنڈت جواہر لال نہرو تک جاری رہا۔

ہندوستانیوں میں قوم پرستی کے جذبات ابھارنے میں بھی انگریزی تعلیم نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ حب الوطنی یا نیشنلزم ایک مغربی تصور ہے جو یورپ کی تاریخ کا پیدا کردہ ہے۔ اس تصور کو ہندوستان میں متعارف کرانے میں انگریزی تعلیم ہی ذریعہ بنی۔ ہندوستانیوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالنے کی ترغیب بھی ایک وظیفہ یاب انگریز بیورو کریٹ اے۔ او۔ ہیوم نے دی تھی۔ نتیجتاً ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی جو بالآخر ایک قومی تحریک ثابت ہوئی۔

تاہم سیاسی اقتدار پر انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے پر کئی منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ انگریز حکمرانوں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ہندوستانی عوام کو مذہبی اور ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی حکمت عملی جاری رکھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی فضا تیار کرنے کے لئے کئی قسم کے جال بچھائے ۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی گئی اور اس طرح قومی تحریک دو حصوں میں منقسم ہوگئی ۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قیام پاکستان کا مطالبہ کیا جبکہ کانگریس ملک کے اتحاد کے مطالبے پر قائم رہی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستان کی سیاسی صورتحال تیزی سے بدلنے لگی۔ انگریز حکمرانوں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

ہندوستان کی آزادی اب ایک ناقابل انکار حقیقت بن چکی تھی۔ تاہم برطانوی حکمرانوں نے طے کرلیا تھا کہ ملک کو تقسیم کرنے کے بعد ہی وہ ہندوستان سے دستبردار ہوں گے۔ ان کے اس ناپاک منصوبے میں ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں نے بھی بالراست یا براہ راست انگریزوں کی معاونت کی اور برصغیر ہند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اس تاریخی سانحے کے بعد پورے برصغیر میں اور خصوصاً پنجاب میں جو بھیانک فسادات برپا ہوئے وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔

فیض احمد فیضؔ نہ تو کانگریسی تھے نہ مسلم لیگی۔ سیاسی عقائد کی حد تک وہ اشتمالی نظریات سے متاثر ضرور تھے لیکن کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ رکن کبھی نہیں رہے۔ تقسیم ہند کے بعد انہوں نے خود کو اس حصے میں پایا جو پاکستان بن چکا تھا۔ اس طرح وہ راتوں رات ہندوستانی نہ رہ کر پاکستانی بن چکے تھے۔

ان کی اس نظم "صبحِ آزادی" کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیضؔ ایسی آزادی سے ناخوش تھے جو تقسیم ملک کے بعد ملی ہو یا کم از کم وہ اس آزادی کو حقیقی ماننے سے اسلئے انکار کر رہے تھے کہ ان کے اشتمالی عقائد کے پیش نظر ابھی وہ انقلاب رونما نہیں ہوا تھا جو طبقاتی اور استحصالی نظام کا خاتمہ کر کے ایک غیر طبقاتی، ترقی پسند اور آزاد معاشرے کی تعمیر کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔ اس نظم پر سردار جعفری نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ نظم جن سنگھی اور مسلم لیگی، دونوں کہہ سکتے تھے۔" میں جعفری صاحب سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک اشتمالی اور ترقی پسند شاعر کیوں نہیں کہہ سکتا؟

تلمیح ۱۴ : قیصر و کِے۔

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں، ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے
(نظم "شورشِ بربط و نے" کا چوتھا بند، ص ۲۹)

اس ڈرامائی نظم میں فیضؔ نے یاسیت اور رجائیت کی آوازوں کو کرداروں کا روپ دے کر نظم کیا ہے۔ قیصر و کے کی تلمیح رجائی آواز کے دوسرے مکالمے میں رقم ہوئی ہے۔ مطلب صاف ہے کہ

انسان حد درجہ نامساعد حالات سے بھی نبرد آزما ہو سکتا ہے جب تک اس کے ہاتھ سلامت رہتے ہیں، اس کے خون میں حرارت باقی رہتی ہے، اس کے دل میں صداقت کا جذبہ زندہ رہتا ہے اور اس کی زبان حق گوئی کا فریضہ نبھاتی رہتی ہے۔ اس بلند ہمتی کے باوصف وہ زنجیروں کی جھنکار کو بھی بربط و نئے کی شورش میں تبدیل کر سکتا ہے، ایسی شورش جس کے سامنے قیصر وکَے کے طبل کا شور ہیچ ٹھہرتا ہے۔

قیصر: لفظ قیصر کے لغوی معنی ہیں وہ بچہ جس کی ماں قبل از ولادت مر گئی ہو اور اسے ماں کے پیٹ کو چیر کر نکالا گیا ہو۔ رومی تاریخ کی روایات کے مطابق ایک بادشاہِ روم افسطوس اسی طرح پیدا ہوا تھا اور تب ہی سے رومی بادشاہوں کا لقب قیصر ہو گیا تھا۔ ان معنوں میں قدیم رومن ایمپائیر کے اکثر بادشاہوں کا لقب قیصر تھا۔

کَے: کَے فارسی میں بمعنی شہنشاہ استعمال ہوتا ہے کیونکہ فردوسی ایران کے ایک قدیم حکمراں سلسلے کا نام کیانیاں بتاتا ہے۔ کَے اسی لفظ کیانی کا مخفف ہے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ ہخانشی بادشاہ اور کیانی سلسلے کے فرمانروا ایک ہی ہیں لیکن ذبیح اللہ صفا اپنی کتاب "حماسہ سرائی در ایران" میں لکھتے ہیں کہ کیانی بادشاہوں کا سلسلہ ہخانشیوں سے بالکل مختلف ہے۔

تلمیح ۱۵ : یوسفؑ

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضع تکلف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسفؑ تو دیکھیے

(قطعہ، ص ۳۰)

حضرت یوسفؑ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر پیغمبروں میں سے ایک تھے جن کے لئے قرآن مجید میں ایک مکمل سورہ معنون ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصّے کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ اسلامی عقائد کی روشنی میں حضرت یوسفؑ کے قصّے کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

حضرت یوسفؑ کے والد حضرت یعقوبؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت کا درجہ عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک مدت تک شام میں رہنے کے بعد کنعان میں آ کر مقیم ہوئے۔ حضرت یوسفؑ کی والدہ کا نام

راحیل تھا۔ ویسے حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے لیکن بی بی راحیل سے صرف دو ہی بیٹے تولد ہوئے۔ ایک حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بنیامین۔ اپنے گیارہ بھائیوں کے مقابلے میں حضرت یوسفؑ نہ صرف بہ اعتبار حسن و جمال بلکہ بلحاظ کمالِ باطن بھی بہت مشہور تھے۔ حضرت یوسفؑ کی پھوپھی انہیں بہت چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی حضرت یعقوبؑ سے درخواست کی کہ وہ حضرت یوسفؑ کی پرورش اپنے گھر میں کرنا چاہتی ہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے انھیں اپنی بہن کے سپرد تو کر دیا لیکن بعد ازاں بیٹے کے فراق میں مضطرب رہنے لگے۔ جب حضرت یوسفؑ کا فراق برداشت سے باہر ہو گیا تو حضرت یعقوبؑ نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے بغیر ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں رہ سکتے اسلئے حضرت یوسفؑ کو واپس بھیج دو۔ حضرت یوسفؑ کی پھوپھی بھی انھیں اپنی نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اسلئے بھائی بہن کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا کہ حضرت یوسفؑ ایک ہفتہ اپنی پھوپھی کے ساتھ رہیں گے اور ایک ہفتہ اپنے والد کے گھر۔ پہلے ہفتے حضرت یوسفؑ اپنی پھوپھی کے ساتھ رہنے لگے۔ سات دنوں بعد جب حضرت یعقوبؑ نے انہیں طلب کیا تو پھوپھی نے حیلے سے ایک خاندانی کمر بند حضرت یوسفؑ کی کمر پر باندھ دیا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی کا مال چراتا اور پکڑا جاتا تو وہ صاحبِ مال کا غلام ہوتا۔ حضرت یوسفؑ کی پھوپھی انہیں ہر حال میں اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں لہٰذا کمر بند کی چوری کرنے کا جھوٹا الزام دھر کر انہوں نے دس برس کے لئے حضرت یوسفؑ کو اپنے بھائی سے چھین لیا۔ تاہم اس واقعہ کے دو برسوں بعد وہ وفات کر گئیں اور حضرت یوسفؑ اپنے والد کے پاس لوٹ آئے۔

حضرت یوسفؑ کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے کے باوصف حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں میں سب سے زیادہ انھیں کو چاہتے تھے۔ اسی سبب دوسرے بھائی ان سے حسد کرتے تھے۔ ایک دن حضرت یوسفؑ نے خواب دیکھا کہ آفتاب و ماہتاب کے ساتھ گیارہ ستاروں نے آسمان سے اتر کر انہیں سجدہ کیا۔ جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والد سے اس خواب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ انھیں خوب نوازے گا اور علمِ تعبیر عطا کرے گا لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس خواب کا تذکرہ اپنے بھائیوں سے نہ کریں۔ اس واقعے کے بعد حضرت یعقوبؑ ایک پل کے لئے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دیتے۔ ایک دن سب بھائیوں نے سازش کی اور سیر و تفریح کے بہانے حضرت یوسفؑ کو شہر کنعاں (موجودہ فلسطین) سے دور ایک جنگل میں لے گئے اور انہیں ایک کنویں میں ڈال دیا۔ پھر ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے اس کا خون حضرت یوسفؑ کے

کرتے میں لگایا اور والد کے سامنے کرتا پیش کر کے کہا کہ حضرت یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔ جب حضرت یعقوبؑ نے خون آلودہ کرتا دیکھا تو وہ کہیں سے پھٹا ہوا نہیں تھا۔ پھر اپنے بیٹوں سے کہا کہ ''اس پیرہن میں یوسفؑ کی بو نہیں پائی جاتی۔ شاید بھیڑیا یوسفؑ پر زیادہ مہربان ہوگا کہ اسے کھالیا لیکن پیرہن نہیں پھاڑا۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو بھیڑیے کو حاضر کرو۔'' تب وہ جنگل سے ایک بھیڑیا پکڑ لائے۔ حضرت یعقوبؑ نے بھیڑیے سے پوچھا ''کیا تو نے ہی میرے بیٹے کو کھایا ہے۔'' خدا کی قدرت سے بھیڑیا بول اٹھا ''یارسول اللہ قسم ہے خدا کی میں نے تیرے یوسفؑ کو نہیں کھایا کیونکہ انبیاء، صلحاء اور سیاحوں کا گوشت ہم پر حرام ہے۔ میں آپ کی بکریوں تک کو تصرف کرنے کا خیال دل میں نہیں لاسکتا، بھلا آپ کے فرزند عزیز کو کیسے کھاؤں گا۔'' حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کی سازش سے دل برداشتہ ہو کر اپنے لئے ایک مکان 'بیت الاحزان' تعمیر کروایا اور عبادت میں مشغول ہوئے۔ دن رات روتے روتے تقریباً نابینا ہو گئے۔

ادھر حضرت یوسفؑ پر جو کچھ گذری اس تعلق سے اہل اسلام کی روایات یوں ہیں کہ جب ان کے بھائی انہیں کنویں میں ڈال کر چلے گئے تو وہ ابھی کنویں کی تہہ تک پہنچے بھی نہ تھے کہ حضرت جبرئیل نے انھیں تھام لیا اور ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ پھر وہ کرتا، جو حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی آگ میں خدا کے حکم سے پہنا تھا اور جسے حضرت یعقوبؑ نے تعویذ بنا کر حضرت یوسفؑ کے بازو پر باندھ دیا تھا، نکال کر انھیں پہنا دیا۔

پھر سوداگروں کا ایک قافلہ شام سے مصر کو جاتا ہوا ادھر سے گذرا۔ اس قافلے کا سردار مالک ابن زعز نامی ایک شخص تھا۔ اس نے اپنے ایک غلام بشرا کو پانی لانے کی غرض سے اس کنویں پر بھیجا۔ جب بشرا نے پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا تو خدا کے حکم سے حضرت جبرئیل نے آ کر حضرت یوسفؑ سے کہا کہ وہ اس ڈول پر بیٹھ جائیں۔ جب غلام نے ڈول کھینچا تو بجائے پانی کے ایک حسین و جمیل لڑکے کو اس میں بیٹھا ہوا پایا۔ وہ حضرت یوسفؑ کو اپنے سردار مالک ابن زعز کے پاس لے گیا۔ ایک روایات کے مطابق حضرت یوسفؑ کے بھائی اس وقت کنویں کے قریب ہی موجود تھے اور دوسری روایت کہتی ہے کہ ان کے بھائیوں نے ایک مخبر وہاں بٹھا رکھا تھا تاکہ اگر کوئی شخص حضرت یوسفؑ کو کنویں سے نکالے تو وہ انھیں فوری خبر کر دے۔ بہر کیف حضرت یوسفؑ کے بھائی وہاں پہنچے اور قافلے والوں سے کہا کہ ''یہ ہمارا غلام ہے، کئی دنوں سے بھاگ گیا تھا، ہم اس کی تلاش میں تھے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو یا تم ہی خرید لو۔'' اپنے بھائیوں کے منہ سے یہ جھوٹے کلمات سن کر حضرت

یوسفؑ نے چاہا کہ کچھ بولیں لیکن ان کے ایک بھائی شمعون نے عبرانی زبان میں ان سے کہا کہ "اگر تم ان سے کچھ کہو گے تو جان سے مار دوں گا۔" قافلے والوں نے تھوڑے بہت کھوٹے درہم دے کر حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں سے خرید لیا اور مصر لے گئے۔ وہاں پہلے ہی ان کے حسن و جمال کی شہرت پہنچ گئی تھی اور لوگ ان کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ قافلے والوں نے حضرت یوسفؑ کو لباس فاخرہ پہنایا اور کرسی پر بٹھا کر اہل مصر سے کہا کہ بڑھ چڑھ کر بولی لگائیں۔

بہر حال فرعونِ وقت کے ایک اعلیٰ عہدیدار، جس کا نام قطفیر اور لقب عزیز تھا، نے ایک خطیر رقم دے کر حضرت یوسفؑ کو مالک بن زعز سے خرید لیا۔ پھر انہیں اپنے گھر لے جا کر اپنی بیوی کو تاکید کی کہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھے۔ اسے حضرت یوسفؑ سے فائدہ ہونے کی امید تھی اور وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انھیں اپنا فرزند بنا لے۔ عزیز کی بیوی کا نام راعیل تھا جو انتہائی حسین خاتون تھی۔ وہ شاہ طیموس کی بیٹی تھی اور زلیخا کے لقب سے مشہور تھی۔ اسے حضرت یوسفؑ سے عشق ہو گیا۔ وہ مختلف تدبیروں اور ترغیبوں سے حضرت یوسفؑ کو رجھانے لگی۔ لیکن حضرت یوسفؑ ثابت قدم رہے اور زلیخا کے عشق میں گرفتار نہ ہوئے۔ زلیخا سات برسوں تک حضرت یوسفؑ کو اپنے دامِ عشق میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو اس نے اپنے پڑوس کی ایک بڑھیا سے اپنے دل کی بات کہہ دی اور اس سے مدد چاہی۔ بڑھیا کے مشورے کے مطابق زلیخا نے ایک عالیشان ہفت خانہ تعمیر کروایا جس کے در و دیوار پر طلا کاری کروائی گئی۔ محل میں ہر جگہ حضرت یوسفؑ اور زلیخا کی باہم تصاویر لگائی گئیں۔ پھر بہانہ کر کے زلیخا، حضرت یوسفؑ کو اس ہفت خانے میں لے گئی اور تمام دروازے مقفل کروا دیے۔ پھر انھیں بغرضِ مباشرت پھسلانے لگی لیکن یوسفؑ راضی نہ ہوئے۔ زلیخا نے جب ان کا ہاتھ پکڑا تو حضرت یوسفؑ گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگے۔ خدا کی قدرت سے مقفل دروازے خود بخود کھل گئے۔ زلیخا ان کے پیچھے دوڑی چلی آئی اور پیچھے سے ان کے پیرہن کا دامن پکڑ کر اسے پھاڑ ڈالا۔ اسی وقت دروازے پر عزیز مصر پہونچا۔ اپنے شوہر کو دیکھ کر زلیخا نے حضرت یوسفؑ پر تہمت لگائی کہ انھوں نے اس پر دست درازی کی۔ یہ ماجرا سن کر عزیز نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ "میں نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا تھا، اپنے گھر کا امین مقرر کیا تھا اور اس کا بدلہ تم نے یہ دیا کہ میری بیوی پر نظر بد رکھتے ہو۔" حضرت یوسفؑ نے جواب دیا کہ "زلیخا مجھ پر ناحق تہمت دھرتی ہے۔ اس نے مجھے بغرض مباشرت پکڑا اور میرے کرتے کا دامن پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔" پاس ہی پالنے میں ایک چھ مہینے کا شیر خوار بچہ لیٹا ہوا تھا۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے

عزیز مصر سے کہا کہ اس بچے سے پوچھ لو۔ خدا کی قدرت سے بچہ بول اٹھا کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو حضرت یوسفؑ سچے ہیں۔ عزیز مصر نے دیکھا کہ کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ حضرت یوسفؑ بے گناہ ہیں اور اصل خطاوار اسکی بیوی ہے اس کے دل میں خیال گذرا کہ زلیخا کو طلاق دے دے۔ لیکن بدنامی کے ڈر سے اس نے اس واقعہ کو راز رکھنا چاہا اور حضرت یوسفؑ اور زلیخا کو بھی تاکید کی کہ اسکا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ تاہم بہت جلد خواتینِ مصر کو اس واقعے کی سن گن مل گئی اور وہ زلیخا کو طعنے دینے لگیں کہ ایسی بے حیا ہے کہ اپنے ہی غلام پر فدا ہو بیٹھی۔

ایک دن زلیخا نے مصر کی کئی خواتین کو اپنے محل میں اکٹھا کیا اور ہر ایک کے ہاتھوں میں ایک ایک چھری اور ایک ایک لیموں تھما دیا۔ پھر حضرت یوسفؑ سے کہا کہ وہ سامنے آئیں۔ جب خواتینِ مصر نے حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال دیکھا تو عالم بے ہوشی میں بجائے لیموں کے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ جب ہوش آیا تو کہنے لگیں کہ یہ شخص آدم زاد نہیں بلکہ کوئی فرشتہ ہے۔ پھر خود پر لعنت کرتے ہوئے تمام عورتوں نے زلیخا کو مبارکباد دی کہ ایسا خوبصورت معشوق پایا۔

زلیخا بہر صورت حضرت یوسفؑ کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو رائے دی کہ انہیں قید میں ڈالا جائے۔ حضرت یوسفؑ خود بھی زلیخا کے یکطرفہ عشق سے تنگ آ چکے تھے۔ اس سے چھٹکارہ پانے کیلئے انھیں قید جانا بھی منظور تھا۔ عزیز مصر نے بدنامی سے بچنے کیلئے انھیں قید کروا دیا۔ اب حضرت یوسفؑ دن رات عبادت الٰہی میں مشغول ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ حضرت یوسفؑ کو علم تعبیر سکھائیں۔ اس علم کو اچھی طرح سیکھنے کے بعد حضرت یوسفؑ دوسرے قیدیوں کے خوابوں کی تعبیریں بتانے لگے۔ اس زمانے میں بادشاہِ مصر جس کا نام ملک ریان تھا، کے دو غلام کسی خطا کے سلسلے میں اسی قید میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک ساقی تھا اور دوسرا باورچی۔ ایک دن دونوں نے خواب دیکھے۔ ساقی نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ انگور کا خوشہ نچوڑ رہا ہے اور باورچی نے دیکھا کہ اس کے سر پر روٹی رکھی ہوئی ہے اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔ دونوں نے اپنے خواب حضرت یوسفؑ کو سنانے کے بعد تعبیر جاننا چاہی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ کل ساقی کو قید سے رہائی ملے گی اور بادشاہ پھر اسے اپنے پرانے کام پر بحال کرے گا اور باورچی کو سولی چڑھایا جائیگا اور پرندے اس کی کھوپڑی توڑ کر مغز کھائیں گے۔ جب تعبیر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی تو حضرت یوسفؑ نے ساقی سے کہا کہ وہ اپنے بادشاہ سے سفارش کر دے کہ ایک بے گناہ

قید کاٹ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت یوسفؑ کی یہ بات پسند نہ آئی اور شیطان نے ساقی کے ذہن سے حضرت یوسفؑ کی کہی ہوئی بات بھلا دی۔ اس طرح سات برسوں تک حضرت یوسفؑ قید ہی میں رہے۔

ایک رات شاہِ مصر ملک ریان نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی گائیں آ کر کھا گئیں اور سات ہری بھری غلے کی بالیوں کو سات سوکھی بالیاں کھا گئیں۔ بادشاہ نے اپنے معتبروں کو یہ خواب سنایا لیکن کوئی بھی اس کی تعبیر نہ بتا سکا۔ پھر اچانک ساقی کو حضرت یوسفؑ کی یاد آئی۔ اس نے بادشاہ سے ذکر کیا۔ بادشاہ نے ساقی کو حضرت یوسفؑ کے پاس بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے تعبیر بتائی کہ سات برسوں تک ملک میں بہت غلہ پیدا ہوگا اور اس کے بعد اگلے سات برسوں تک ملک میں قحط سالی رہے گی۔ بادشاہ نے پھر پیغام بھجوایا کہ قحط سالی کے برسوں کے دوران بھک مری سے بچنے کے لئے کیا تدبیر کی جائے۔ حضرت یوسفؑ نے رائے دی کہ پہلے سات برسوں میں جب غلے کی افراط ہوگی تو بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کے بعد فاضل غلے کو پس انداز کیا جائے تاکہ اگلے سات برسوں میں پریشانی نہ ہو۔ بادشاہ نے یہ تجویز سنی تو بہت خوش ہوا اور حضرت یوسفؑ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ قید سے اس وقت تک رہائی کے خواہاں نہیں تھے جب تک ان پر لگائی گئی تہمت کا داغ دھل نہ جائے۔ بادشاہ نے تفتیش کروائی اور زلیخا نے اپنا جرم قبول کیا۔

ملک ریان نے حضرت یوسفؑ کو سارے ملک کے اناج و غلے کا مختارِ کل مقرر کیا۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے حسنِ انتظام سے پہلے سات برسوں میں وافر مقدار میں غلہ گوداموں میں پس انداز کیا اور جب قحط سالی کے برس آئے تو گوداموں کے منہ کھول دیئے۔ اس طرح سوائے مصر کے اطراف واکناف کے دوسرے ممالک میں غلے کی شدید قلت تھی۔ لوگ دور دراز کے ممالک سے غلہ خریدنے کے لئے مصر آنے لگے۔ ملک ریان حضرت یوسفؑ سے بے انتہا خوش تھا۔ اس نے حکومت کا تقریباً سارا انتظام ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ اب عملاً حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ تھے۔

زلیخا کے اقبالِ جرم کے بعد اس کے شوہر عزیز نے اسے طلاق دے دی تھی اور کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ لیکن زلیخا اب بھی حضرت یوسفؑ کے عشق میں دیوانی تھی۔ ہجرِ محبوب میں اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا اور قبل از وقت بوڑھی اور نابینا ہو گئی تھی۔ ایک دن اتفاقاً حضرت یوسفؑ کی ملاقات زلیخا سے ہوئی۔ انہوں نے جب اس کی ابتر حالت دیکھی تو ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے اسے دعوتِ اسلام دی۔ اس نے صدقِ دل سے اسلام قبول

کیا۔ پھر حضرت یوسفؑ نے اس کے حق میں دعا مانگی جو قبول ہوئی اور فوری طور پر وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین وجمیل ہوگئی۔ اس کی بینائی بھی لوٹ آئی۔ اسکے بعد وہ چالیس دن تک مسلسل حق تعالیٰ کی عبادت کرتی رہی۔ بعدازاں حضرت یوسفؑ نے اس سے نکاح کیا۔

کنعان میں جب قحط سالی کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت یوسفؑ کے دس بھائی غلے کی خریداری کیلئے مصر پہنچے۔ حضرت یوسفؑ نے انھیں پہچان لیا لیکن وہ انھیں نہ پہچان سکے۔ حضرت یوسفؑ نے ان کے ساتھ بہت نیک برتاؤ کیا اور بہت سا غلہ ان کے حوالے کیا۔ جاتے وقت یہ تاکید بھی کی کہ وہ جب دوسری دفعہ آئیں تو اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو بھی ساتھ لیتے آئیں جو حضرت یوسفؑ کا سگا بھائی تھا۔ چنانچہ دوسری دفعہ ان کے بھائیوں نے بن یامین کو بھی ساتھ لایا۔ حضرت یوسفؑ نے ایک حیلے سے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور دوسرے بھائیوں سے کہا کہ اگلی دفعہ وہ اپنے والد کو بھی لیتے آئیں۔ بالآخر حضرت یعقوبؑ بھی مصر تشریف لائے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے ماں باپ کو لے جا کر تخت پر بٹھایا اور سب بھائی ان کے آگے سجدے میں گرے۔ تب حضرت یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا کہ جو خواب میں نے بچپن میں دیکھا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔

قدیم عہد نامے کے مطابق حضرت یوسفؑ، جن کے لئے عبرانی میں لفظ Joseph استعمال ہوا ہے، حضرت یعقوبؑ (Jacob) کے گیارہویں بیٹے تھے اور ان کی والدہ کا نام راحیل (Rachel) تھا۔ عبرانی زبان میں جوزف (Joseph) کے لغوی معنی ہیں 'وہ جو اضافہ کرے گا'۔ یہودیوں کی کتاب پیدائش (Genesis) کی رو سے حضرت یوسف راحیل کی پہلی اولاد تھے۔ چونکہ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کو اپنے تمام بیٹوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اس لئے دوسرے بھائی ان سے حسد کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت یعقوبؑ نے ایک خوبصورت اور رنگین پیرہن (Coat of many colours) حضرت یوسفؑ کو بطور تحفہ دیا۔ اس پر ان کے بھائیوں کی حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے سوداگروں کے ہاتھ انھیں بیچ دیا۔ کتاب پیدائش (Genesis) میں حضرت یوسفؑ کا بطور غلام بیچا جانا، مصر کے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتانا، حکومت کا مختار کل بننا اور ان کے بھائیوں اور والد کا مصر میں آنا وغیرہ کا ذکر تو ہے لیکن زلیخا والا قصہ نہیں ملتا۔ کتابِ پیدائش کی رو سے حضرت یعقوبؑ مصر میں قیام پذیر ہوئے اور اس طرح بنی اسرائیل کی نسل مصر میں اس وقت تک چلتی رہی جب تک حضرت موسیٰ انہیں ساتھ لے کر مصر سے باہر نہیں گئے۔ اس نقلِ مکانی کے وقت حضرت موسیٰ نے حضرت یوسفؑ کا ڈھانچہ قبر سے نکالا اور اپنے ساتھ لے

جا کر شیخم (Shechem) کے مقام پر دفن کیا۔

تلمیح ۱۶ : منصور و قیس

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گلدامنی و کج کلہی
(قطعہ، ص ۳۸)

فیض کی شاعری کا بنیادی رنگ عشق و محبت کا رنگ ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری کے دو پہلو خاص طور سے نمایاں ہیں جنہیں انہوں نے ''سنتِ منصور و قیس'' کہا ہے۔ فیض کو عشق کی ان دونوں اقسام سے رغبت تھی جنہیں روایتی اصطلاح میں عشقِ حقیقی و عشقِ مجازی کہا جاتا ہے۔ منصور عشق حقیقی کی انتہا ہے جبکہ قیس عشق مجازی کا استعارہ۔

منصور : اردو و فارسی ادب میں عشقِ حقیقی سے مراد وہ عشق ہے جس کا اظہار ایک بندۂ خدا اس تمام کائنات کے تخلیق کار یعنی حقِ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے۔ عشقِ حقیقی میں روحانی مسرت سے سرشار ہو کر عاشق دنیوی معاملات و مسائل سے بے خبر اور لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقتِ مطلق میں اپنے آپ کو مدغم کر کے فنا کے درجے تک پہنچتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے وحدت الوجود کہتے ہیں کہ عاشق کو کائنات کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے حتیٰ کہ وہ خود کو بھی حق تعالیٰ کا مظہر سمجھنے لگتا ہے۔

منصور کا نام مشرقی شاعری میں اسی نوع کے عشق کا استعارہ ہے کہ جب انہوں نے نعرۂ اناالحق بلند کیا تھا تو وہ بطور صوفی درجۂ انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ دوسری طرف عشقِ مجازی کا تعلق دو افراد کی آپسی محبت سے ہے یعنی ایک مرد ایک جیتی جاگتی گوشت پوست والی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر دنیا و مافیہا کو بھلا بیٹھتا ہے اور اس کے عشق میں اپنے آپ کو مٹا دیتا ہے۔ قیس (مجنوں) کی لیلیٰ کے لئے محبت اسی نوعیت کی تھی اور اسی لئے عشق مجازی کے ضمن میں اس کا نام ہماری شاعری میں استعارہ بن گیا۔

تصوف کی تاریخ میں منصور حلاج کی شخصیت اور اس کے افکار کی نوعیت متنازعہ فیہ ہے۔ ان

کے زمانے میں علماء اور صوفیا کی اکثریت نے ان کے عقائد و نظریات کی مخالفت کی تھی لیکن آہستہ آہستہ بعد کے صوفیا اور علماء نے اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کیا اور منصور حلاج کی حمایت کی۔

منصور حلاج کا اصلی نام حسین تھا لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ اپنے والد، منصور حلاج کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابوالمغیث ان کی کنیت تھی۔ وہ ۸۵۷ء میں ایران کے ایک چھوٹے سے گاؤں طور میں پیدا ہوئے جو شیراز کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ ان کے والد کے لقب، حلاج کے تعلق سے ایک عام روایت یہ ہے کہ ان کے والد روئی دھننے کا کام کرتے تھے اسی سبب حلاج کہلاتے تھے۔ فریدالدین عطارؒ اس تعلق سے فرماتے ہیں کہ" ایک مرتبہ اس (منصور حلاج) نے کپاس کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جس سے فوراً ہی بنولہ کپاس سے الگ ہو گیا۔ اسی کرامت کی وجہ سے لوگوں نے حلاج کا لقب دے دیا۔" (بحوالہ" تاریخ تصوف" از علامہ اقبال، مرتب صابر کلوروی، مکتبۃ الحسنات، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۲)

حلاج کے والد منصور البیغاوی الحلاج تلاشِ معاش میں شہر واسط میں آباد ہو گئے تھے۔ حلاج کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ سولہ برس کی عمر میں حافظِ قرآن ہو گئے۔ طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی اس لئے سہیل بن عبداللہ تستری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جب بیس برس کے ہوئے تو اپنے مرشد سے اجازت لئے بغیر بصرہ چلے گئے اور وہاں حسن بصری کے مکتب میں داخلہ لیا۔ بصرہ میں بنی مجاشع سے ان کے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ یہ گروہ حکومتِ وقت کا مخالف سمجھا جاتا تھا چنانچہ حکومت کے کارندوں نے حلاج کو بھی تنگ کرنا شروع کیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر وہ بغداد پہنچے اور عمرو بن عثمان مکی کے مرید بن گئے۔ یہیں انہوں نے باضابطہ طور پر خرقہ تصوف پہنا۔ کچھ عرصہ بعد ابو یعقوب اقطع کی بیٹی سے شادی کی۔ اس شادی کی وجہ سے ان کے پیر عمرو بن عثمان مکی ان سے ناراض ہو گئے کیونکہ ابو یعقوب اقطع سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اپنے پیر کی ناراضگی کے سبب حلاج ان سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہوئے اور جنید بغدادیؒ کے پاس تقریباً چھ برسوں تک مقیم رہے۔

اس دوران منصور حلاج کے مریدوں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور اسی کے ساتھ ان کا اثر و رسوخ بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ اعیانِ حکومت سیاسی وجوہات کی بناء پر انھیں خطرناک شخص سمجھتے تھے۔ انھیں اور انکے مریدوں کو طرح طرح سے ستایا جانے لگا۔ ان حالات میں حلاج بغداد چھوڑ کر مکہ روانہ ہوئے۔ حج کرنے کے بعد تین سال تک وہیں مقیم رہے۔ پھر خوزستان اور مشرقی ایران میں پانچ برس گذارے۔ ایک دفعہ پھر بیت اللہ کی زیارت کی۔ دوسرا حج کرنے کے بعد ہندوستان کا سفر بھی

کیا۔

اس پورے عرصے میں ان کے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی سبب حکومتِ وقت کی ان پر کڑی نظر تھی۔ وزیرِ اعظم حامد بن عباس تو ان کے تعلق سے اس قدر شاکی تھے کہ انہوں نے خلیفۂ وقت مقتدر باللہ کو یہ مشورہ دیا کہ منصور حلاج کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اہلِ سیاست نے ان کے خلاف اپنی کارروائی کی ابتداء کی۔ ان کے عقائد و نظریات کو خلاف شریعت ثابت کرنے کے لئے مفتیوں اور عالموں سے ربط پیدا کیا گیا۔ ان کے خلاف پہلا فتویٰ داؤد اصفہانی نے دیا۔ اسے بنیاد بنا کر منصور حلاج کو گرفتار کیا گیا۔ جیل میں ایک سال گذارنے کے بعد یہ فرار ہو گئے اور تین سال خوزستان میں گذارے لیکن پھر گرفتار ہوئے اور آٹھ سال جیل میں گذارنے کے بعد رہا کئے گئے۔ فوری ہی وزیرِ اعظم حامد بن حسن کی ایماء پر پھر گرفتار کئے گئے اور ان پر کفر کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ علماء نے ان کے خلاف چور اسی شہادتیں پیش کیں اور اس بناء پر انھیں ۲۷ / مارچ ۹۲۲ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اسکے بعد ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور انھیں نذرِ آتش کیا گیا۔ کتاب "الفہرست" کے مصنف ابنِ ندیم نے لکھا ہے کہ پھانسی دیئے جانے سے قبل حلاج نے کہا تھا، "اے رب اگر تو ان لوگوں کو بھی وہی کچھ دکھا دیتا جو میں دیکھ رہا ہوں تو یہ مجھے کبھی سزا نہ دیتے اور مجھ سے وہ چیز چھپا لیتا جو ان سے چھپا رکھی ہے تو میں کبھی انا الحق کا نعرہ نہ لگاتا۔ اے اللہ میرے قاتلوں کو معاف کر دے۔"

(بحوالہ "تاریخ تصوف" از علامہ اقبال، مرتب صابر کلوروی، مکتبۂ الحسنات، دہلی، ۱۹۸۹، ص ۸۳)

"تذکرہ اولیاء" میں درج ہے کہ حلاج کے ہر عضو سے انا الحق کی آواز آتی تھی۔ اسی طرح "تاریخ قزوینی" میں مذکور ہے کہ "جب منصور کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا گیا تو اس نے کہا جب مجھے جلایا جائیگا تو دجلہ کا پانی چڑھ جائے گا۔ اس سے بغداد کے غرق ہو جانے کا خدشہ ہوگا۔ ایسے وقت میں میری راکھ کو اس پانی میں ڈال دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب راکھ پانی میں پھینکی گئی تب سیلاب تھما۔" (ایضاً ص ۸۳ و ۸۴)

ابن ندیم کی کتاب 'الفہرست' سے پتہ چلتا ہے کہ حلاج ۴۶ کتابوں کے مصنف تھے جن میں عربی کا ایک دیوان بھی شامل ہے۔ یہ تمام تصانیف تصوف، علم الکلام اور فلسفہ کے متعلق ہیں جن میں ان کی کتاب "طواسین" کافی مشہور ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر آچکا ہے کہ حلاج کے عقائد و نظریات کی نوعیت متنازعہ فیہ ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے متعلق نامور علماء و صوفیاء کی آراء من و عن پیش کر دی جائیں۔ ان کے مخالفین انھیں کافر کہتے ہیں اور ان کے دار پر کھینچے جانے کو درست

قرار دیتے ہیں جبکہ ان کے حمایتی انھیں شہید کہتے ہیں۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں منصور حلاج کی بہت مذمت کی ہے۔ ابن ندیم کے خیالات کو علامہ اقبال نے اپنی کتاب ("تاریخ تصوف" مرتب صابر کلوروی، مکتبہ الحسنات، دہلی ،ص ۱۹۸۹ء) میں حواشی کی شکل میں لکھا ہے جو اس طرح ہیں" خلیفہ مقتدر کے سامنے لایا گیا تو اس نے اس کو جاہل پایا، سوم قرآن سے۔ قید خانے میں ڈالا گیا تو سنی طریق کے مطابق رہنے لگا۔ ہر کسی کے سامنے اس کے مذہب کا ہو جاتا ہے۔ وہ دراصل آٹھویں امام علی الرضا کا داعی تھا۔ بعد میں قرمطی تحریک سے تعلق رکھنے لگا، اور حقیقت میں ایک پولیٹیکل سازشی تھا جس کا مقصد حکومت کو برطرف کرنا تھا۔ خود خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے شاگردوں کو پیغمبروں کے ناموں سے موسوم کرتا تھا۔" (ص ۶۶) اسی طرح چند دوسرے علماء اور صوفیا مثلاً شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گورگانی، شیخ ابوعلی فارموی، امام یوسف ہمدان وغیرہ کی آراء بھی منصور حلاج کے حق میں نہیں ہیں۔ دوسری طرف کئی دوسرے علماء اور صوفیاء ہیں جو منصور کے نعرۂ انا الحق کی توجیہ اس کے لغوی معنوں میں نہیں بلکہ اس بے خودی اور سرمستی کو پیشِ نظر رکھ کر کرتے ہیں جو ذکر اور مراقبے کے دوران پیدا ہوتی ہے اور اسی سبب اسے بے گناہ سمجھتے ہیں۔ ان حمایتین میں شیخ ابوبکر شبلی، داتا گنج بخش، فریدالدین عطارؒ، امام غزالیؒ، عبداللہ خفیف، ابوالقاسم نصرآبادی وغیرہ شامل ہیں۔ شیخ فریدالدین عطار تو حلاج کو" قتیل اللہ فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ ابوبکر شبلی کا بیان ہے کہ" میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ لوگوں نے مجھے دیوانہ قرار دے دیا اور یوں میری نجات ہو گئی لیکن حسین کو اس کی عقل نے ہلاک کر ڈالا۔" (ایضاً ص ۸۴)

غزالی نے حلاج کا دفاع کرتے ہوئے 'مشکوۃ الانوار' میں لکھا ہے کہ" منصور حلاج کے یہ فقرے عالم سکر میں نکلے تھے جس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔" (ایضاً ص ۵۸) منصور حلاج کے تعلق سے انتہائی بلیغ اور اعتدال پسند رائے سید سلیمان علی ندوی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں،" حلاج شہید انا الحق نہ تھا، قتیل راہِ سیاست تھا۔ اس کی حیثیت مذہبی گناہ گار کی اتنی نہیں جتنی ایک پولیٹیکل مجرم کی ہے۔ اس بے گناہ کا خون علماء کے قلم پر نہیں بلکہ سلاطین کی تلوار پر ہے۔" (ایضاً ص ۸۶، ۸۷)

قیس: مشرق کی عشقیہ داستانوں میں قیس (مجنوں) و لیلیٰ کی داستانِ عشق سب سے زیادہ مشہور ہے۔ تقریباً ہر زمانے میں اس داستان کو مختلف پیرایوں اور مختلف فنونِ لطیفہ کے ذریعہ پیش

کیا گیا۔ فارسی شعراء نے ایک زمانے میں اس قصے کو اپنی مثنویوں کا موضوع بنایا جن میں نظامی گنجوی کی مثنوی کافی مشہور ہے۔ اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی نے اس قصے کو بڑی خوبصورتی سے منظوم کیا ہے۔

عصر حاضر میں جبکہ فلم اور ٹیلی ویژن ہماری ثقافت پر حاوی ہیں، لیلیٰ مجنوں کی داستان کسی نہ کسی روپ میں دہرائی جاتی ہے۔ برصغیر میں اس داستان پر کئی فلمیں بن چکی ہیں۔ غرضیکہ، گو یہ داستان عرب کی ثقافتی تاریخ کا حصہ ہے لیکن اس نے برصغیر کے عوامی حافظے میں بھی اپنی جڑیں پیوست کر لی ہیں۔

لیلیٰ مجنوں کا قصہ واقعتاً تاریخی ہے یا محض افسانہ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ مشہور مستند عرب مورخین اسے صرف افسانوی ادب کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہ قصہ اتنا موثر اور مشہور ہے کہ عام لوگ لیلیٰ اور مجنوں کو تاریخی کردار سمجھتے ہیں۔ یہ بھی طے نہیں ہو سکا کہ اس قصے کا تعلق تاریخ عرب کے کس دور سے ہے۔ عام روایت تو یہ ہے کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کا تعلق قبلِ اسلام یعنی ایامِ جاہلیت سے ہے لیکن بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن میں لیلیٰ اور مجنوں کو مسلمان بتایا جاتا ہے۔ ایک روایت کی رو سے مجنوں حضرت امام حسین کا دودھ شریک بھائی تھا۔ لیکن بعض محققین اسے غلط ثابت کر چکے ہیں۔ ان کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام حسین کا دودھ شریک بھائی قیس بن ذریح تھا اور اس کی محبوبہ کا نام لبنیٰ تھا۔ اس لئے قیس و لبنیٰ کے عشق کا قصہ لیلیٰ مجنوں کی داستان سے مختلف ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مجنوں کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا یعنی اس کی پیدائش دورِ اسلام میں ہوئی ہوگی۔ لیلیٰ کے تعلق سے ایک روایت مشہور ہے کہ وہ بنی امیہ کے دور میں (۷۹ھ ۶۹۸ء) زندہ تھی۔ تاہم ان تمام روایتوں کی پشت پناہی کے لئے کوئی ٹھوس تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں۔

بہرکیف مشہورِ زمانہ عاشق مجنوں کا اصلی نام قیس بن عامری تھا جو اپنے ہی قبیلہ عامر کی ایک لڑکی لیلیٰ بنت سعد کا اس حد تک عاشق ہوا کہ اسکے ہجر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور صحرا نوردی اختیار کی۔ جنون کی حد تک لیلیٰ کے عشق میں گرفتار ہونے کی وجہ سے قیس عرف عام میں مجنوں کے لقب سے مشہور ہوا۔ قیس کا لیلیٰ کے عشق میں دنیا و مافیہا کو بھلا بیٹھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سچا عاشق صرف محبوبہ کے حسن یا جسمانی خدوخال پر فریفتہ نہیں ہوتا کیونکہ کہا جاتا ہے کہ لیلیٰ نہ تو بہت زیادہ خوبصورت تھی اور نہ ہی گوری چٹی (لڑکی کا گورا پن مشرقی مردوں کی کمزوری سمجھا جاتا ہے)۔ لیلیٰ

اپنے قبیلے کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں سانولی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا نام لیلیٰ (رات یا سیاہ فام) رکھا گیا تھا۔

قیس بچپن ہی سے لیلیٰ پر مرمٹا تھا۔ لیلیٰ بھی قیس کو دل و جان سے چاہتی تھی لیکن قبیلے کے سردار اور افرادِ خاندان ان کے عشق کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ لیلیٰ کے باپ نے اسکے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کردی اور قیس کو بھی تاکید کردی گئی کہ وہ لیلیٰ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ قیس پر یہ پابندی بہت گراں گذری۔ اس نے دنیوی زندگی اور آرام و آسائش تج دیئے اور دن رات آوارہ گردی کرنے لگا۔ قبیلے والوں کی نظروں میں وہ دیوانہ ہو چکا تھا چنانچہ انھوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک شروع کیا جو ایک دیوانے شخص کے ساتھ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر ہنستے، اس کا مذاق اڑاتے اور بچے اس پر اینٹ پتھر پھینکا کرتے۔ ان نامساعد حالات کے پیش نظر قیس شہر چھوڑ کر صحرائے نجد کی خاک چھاننے لگا۔ اب اس کا عشق جنون میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے ہر اونٹ پر ناقہ لیلیٰ کا دھوکا ہوتا۔ وہ ہر اونٹ کے گھنٹیوں کی آواز سن کر اس کے پیچھے دوڑا چلا جاتا۔ لیکن جب لیلیٰ کا دیدار نہ ہوتا تو آہ وزاری کرنے لگتا۔

لیلیٰ تو خاندانی اور معاشرتی جکڑبندیوں کے آگے مجبور تھی۔ اس کے باپ نے زبردستی اس کی شادی کسی اور شخص سے کردی لیکن لیلیٰ، قیس کو اپنے دل سے بھلا نہ سکی اور اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ جب مجنوں تک لیلیٰ کی موت کی خبر پہنچی تو وہ دوڑا دوڑا لیلیٰ کی قبر پر پہنچا اور اس سے لپٹ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

تلمیح ۱۶ : فرہاد و جم۔

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

(مقطعِ غزل، ص ۴۴)

فرہاد: فارسی و اردو شاعری میں راہِ عشق میں جاں سپاری کا فریضہ ادا کرنے کے سلسلے میں فرہاد کا نام بھی بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ شیریں فرہاد کی داستان ایران کی ثقافتی تاریخ اور فارسی ادب کا سرمایہ ہے۔ یہ سرمایہ بعد ازاں اردو میں منتقل ہوا چونکہ ادب اردو کی پرورش و پرداخت بڑی حد تک فارسی کے زیر سایہ ہوئی۔

فرہاد کا قصہ داستانِ خسرو و شیریں کا ایک حصہ ہے جسے نظامی گنجوی نے اپنی مثنوی میں منظوم کیا ہے۔ خسرو، بادشاہ ہرمز کا بیٹا تھا جس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ اس کی تربیت بھی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی اسی لئے وہ اپنے وقت کے مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ ہرمز ایک انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔ اسے اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت تھی تاہم وہ حق و انصاف کے سلسلے میں اپنی جان سے عزیز بیٹے کو سزا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ خسرو پرویز کے گھوڑے نے ایک کھیت کی تیار شدہ فصل کو برباد کر دیا اور اس کے ایک غلام نے ایک کسان کے باغ میں چوری چھپے داخل ہو کر جب انگور کے خوشے چرائے تو رعایا نے ہرمز سے شکایت کی۔ ہرمز نے فیصلہ سنایا کہ خسرو کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں، اسکے غلام کو کسان کا غلام بنا دیا جائے اور خسرو کا تخت کسان کے حوالے کیا جائے۔

سزا سن کر خسرو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے صدقِ دل سے معافی کی درخواست کی۔ ہرمز نے جب محسوس کیا کہ اس کا بیٹا اپنی غلطی پر نادم ہے تو اپنا فیصلہ منسوخ کر کے خسرو کو ولی عہدِ سلطنت مقرر کیا۔ اسی رات خسرو نے خواب میں اپنے دادا کا دیدار کیا جنہوں نے اسے بشارت دی کہ چونکہ وہ اپنی غلطی پر نادم ہو کر بخوشی سزا بھگتنے تیار ہو گیا تھا تو اس کے عوض اسے شیریں نامی معشوقہ بطور انعام ملے گی۔

کچھ عرصہ بعد خواب کی تعبیر بھی مل گئی۔ خسرو کے ایک دوست شاہ پور نے جو فنِ مصوری میں کمال کا درجہ رکھتا تھا اسے یہ مژدہ سنایا کہ اران سے ازمنستان کے علاقے پر ایک ملکہ کی حکومت ہے جس کا نام مہین بانو ہے۔ اس کی بے حد حسین و جمیل بھتیجی بھی ہے جس کا نام شیریں ہے۔ شاہ پور نے شیریں کے حسن کی اتنی تعریف کی کہ خسرو غائبانہ طور ہی پر اس کا عاشق ہو گیا اور شاہ پور سے کہا کہ کچھ ایسی سبیل کر جس کے سبب شیریں کے دل میں بھی اس کے لئے محبت کا جذبہ جاگے۔ شاہ پور نے ازمنستان کا رخ کیا۔ ماہر مصور تو تھا ہی اس لئے خسرو کی ایک تصویر بنائی جسے دیکھ کر شیریں بھی خسرو کو دل دے بیٹھی۔ محبت میں گرفتار ہونے کے بعد شیریں کے دل میں خسرو سے ملاقات کرنے کا جذبہ جاگا۔ اس سلسلے میں اس نے بھی شاپور سے مدد مانگی اس نے شیریں کو رائے دی کہ وہ ازمنستان سے بھاگ کر مدائن کی راہ لے۔ ساتھ ہی شیریں کو خسرو کی ایک انگوٹھی بھی دی تا کہ وہ مدائن پہنچنے کے بعد اس کی مدد سے محل میں داخل ہو سکے۔ شیریں نے فوری شکاریوں کا لباس پہنا اور اپنے گھوڑے شبدیز پر سوار ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئی۔ میلوں کا سفر طے کرنے کے بعد ایک

مرغزار میں نہادھو کر سستانے کے لئے رکی۔

ادھر خسرو بے صبری سے شیریں کی آمد کا انتظار کرتا رہا اور جب اس کے صبر کا پیانہ چھلک پڑا تو محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ازمنستان کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسی مرغزار میں رکا جہاں شیریں بھی دم لینے کے لئے رکی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں لیکن وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ پائے۔ اس طرح شیریں مدائن کی طرف چل پڑی اور خسرو ازمنستان کی طرف۔

مدائن پہنچ کر شیریں کو پتہ چلتا ہے کہ خسرو وہاں نہیں ہے۔ وہ بہت افسردہ ہو گئی۔ پھر مدائن کی گرم آب و ہوا بھی اس کی صحت کیلئے مضر تھی۔ اس نے محل کے کارندوں کو حکم دیا کہ اسکے قیام کے لئے پہاڑیوں کے دامن میں ایک محل تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ کرمان شاہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر شیریں کی رہائش کیلئے محل تعمیر ہوا۔ خسرو جب ازمنستان پہنچا تو شیریں کو وہاں نہ پا کر مزید اضطراب میں مبتلا ہوا۔ ازمنستان کی ملکہ مہین بانو نے اس کے لئے عیش و آرام کے تمام سامان مہیا کئے۔ پھر خسرو کی ملاقات اپنے دوست شاہ پور سے ہوئی۔ اس نے اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ خسرو کے حکم پر شاہ پور شیریں کو مدائن سے لانے کے لئے روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر شیریں کو اطلاع دی کہ خسرو ازمنستان میں اس کا منتظر ہے۔ دونوں نے ازمنستان کا رخ کیا۔ اسی دوران خسرو کے باپ اور شاہِ مدائن، ہرمز انتقال کر گیا۔ جب یہ خبر خسرو تک پہنچی تو وہ کاروبارِ سلطنت سنبھالنے کے لئے مدائن کی طرف روانہ ہوا۔ اس افراتفری میں ایک بار پھر شیریں اور خسرو کی ملاقات نہ ہو پائی۔

مدائن میں خسرو کی تخت نشینی کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا لیکن نوجوان بادشاہ اپنی سلطنت کا انتظام پوری طرح سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ ایک ہمسایہ سلطنت کا بادشاہ بہرام چوبیں مدائن پر حملہ آور ہوا۔ خسرو کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ خود جان بچا کر آذربائیجان بھاگ گیا۔ کچھ عرصے تک موقان نامی مقام پر قیام کیا اور اس کے بعد ازمنستان پہنچا۔ یہاں پہلی مرتبہ خسرو اور شیریں کی باضابطہ ملاقات ہوئی۔ مہین بانو نے حسبِ سابق خسرو کے ساتھ اپنا حسنِ سلوک برقرار رکھا۔ خسرو اور شیریں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے لیکن خسرو جلد از جلد شیریں سے وصال کا خواہشمند تھا۔ شیریں انکار کرتی رہی اور ایک دفعہ تو یہ طعنہ بھی دیا کہ اسے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ اس بات پر برہم ہو کر خسرو قسطنطنیہ چلا گیا اور مدائن کی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے قیصرِ روم سے مدد کی استدعا کی۔ قیصر روم مدد دینے کے لئے اس شرط پر راضی ہوا کہ خسرو اس کی بیٹی مریم سے شادی کر لے۔ چنانچہ خسرو اور مریم کی شادی ہوئی اور خسرو نے قیصرِ روم کی مدد

سے مدائن پر حملہ کر کے بہرام چوبیں کو شکست دی اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی۔ اب اسے تمام دنیوی آسائشیں میسر تھیں۔ قیصر روم کا داماد ہونے کی وجہ سے اس کی حکومت کو استحکام بھی حاصل تھا لیکن پھر بھی وہ شیریں کے فراق میں بے چین رہتا۔

خسرو کے چلے جانے کے بعد شیریں کو اپنی حرکت پر بہت تاسف ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہی مہین بانو کا انتقال ہوا اور شیریں ازمنستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوئی۔ اسے خسرو کے بادشاہ بننے اور مریم سے اس کی شادی ہونے کی خبر بھی ملی۔ لیکن اس خبر نے اس کے دل میں خسرو کی محبت کی آگ کو اور دہکا دیا۔ وہ خسرو کو ہر حال میں اپنا بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی حکومت کو ایک غلام کے حوالے کیا اور مدائن پہنچی۔ اسی محل میں قیام کیا جو خاص اس کیلئے تعمیر کیا گیا تھا، لیکن اس مقام پر دودھ کی قلت تھی۔ شیریں کی کنیزوں کو دودھ لانے کے لئے بہت لمبا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ اس بنے اس مشکل کا ذکر شاہ پور سے کیا۔ اس مشکل کا حل ڈھونڈ نکالنے کے لئے شاہ پور نے اپنے دوست فرہاد کو شیریں سے ملایا۔ اس طرح پہلی دفعہ اس مقام پر داستان میں فرہاد کا کردار سامنے آتا ہے درحقیقت فرہاد اور شاہ پور ایک ہی معلّم کے طالب علم تھے۔ شاہ پور نے فنِ مصوری کی تعلیم لی تھی اور فرہاد نے فنِ مجسمہ سازی کی۔

پہلی ہی ملاقات میں فرہاد، شیریں کے حسن اور اندازِ تکلم پر فریفتہ ہو گیا۔ شیریں، فرہاد کو حکم دیتی ہے کہ وہ ایک ایسی نہر تعمیر کرے جس کے ذریعہ دودھ محل تک پہنچ سکے۔ فرہاد نے ایک مہینے میں نہر کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا۔ اب گوالے اپنی چراگاہ سے نہر میں دودھ ڈالتے اور وہ بآسانی محل تک پہنچ جاتا۔ شیریں نے خوش ہو کر فرہاد کو اپنے محل بلایا اور بہت تزک و احتشام سے اس کا استقبال کیا۔ اس کی مہارت کے صلے میں اسے ہیرے جواہرات کا تحفہ پیش کیا۔ لیکن فرہاد کو ہیرے جواہرات میں کب دلچسپی تھی۔ وہ تو شیریں کے حسن کا دیوانہ اور اس کے عشق میں اپنا چین و سکون گنوا بیٹھا تھا۔ اس نے تمام ہیرے جواہرات شیریں کے قدموں میں نچھاور کئے اور جنگل کی راہ لی۔ دن بھر جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور رات کو چپکے سے شیریں کے محل میں پہنچتا۔ دودھ کا ایک گھونٹ پیتا اور پھر جنگل کی طرف چلا جاتا۔ شیریں ہفتے میں ایک بار فرہاد کو اپنے گھر مدعو کرتی تھی لیکن ان ملاقاتوں کے دوران وہ منہ سے کچھ نہ بولتا تھا بس ٹکٹکی باندھے شیریں کو دیکھتا رہتا۔

رفتہ رفتہ فرہاد کے عشق کا چرچا پھیلتا گیا۔ خسرو کے کانوں تک جب یہ خبر پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا۔ وہ چاہتا تو فرہاد کو قتل کروا دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ فرہاد تو شیریں کے حسن پر فریفتہ ہو کر اپنے

ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ اس نے مشیروں کی صلاح پر فرہاد کو دربار میں طلب کیا، اور ہیرے جواہرات کی لالچ دے کر اسے حکم دیا کہ وہ شیریں کو بھول جائے۔ فرہاد نے دولت کے عوض اپنی محبت کا سودا کرنے سے انکار کردیا۔ تب خسرو نے ایک اور چال چلی۔ اس نے فرہاد کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر وہ بیستوں پہاڑ کو کاٹ کر آمدورفت کا راستہ بنالے تو شیریں اسے مل جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ فرہاد اس سخت جاں کام کو انجام دیتے دیتے خود ختم ہوجائے گا اور اس طرح مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ فرہاد نے پہلے تو اس کام کو انجام دینے میں ہچکچاہٹ دکھائی لیکن جب خسرو نے اسے شیریں کی قسم دی تو وہ اس شرط پر راضی ہوا کہ اگر وہ پہاڑ کاٹ کر آمدورفت کا راستہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہوجائے تو خسرو اپنے دل سے شیریں کا خیال نکال دے گا۔ خسرو نے اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے مصلحتاً فرہاد کی شرط مان لی۔

اب فرہاد نے بیستوں پہاڑ کو کاٹنے کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے اس نے پہاڑ کی ایک جانب شیریں کا مجسمہ بنایا اور دوسری جانب شیریں کے گھوڑے شبدیز کا۔ اس کے بعد وہ جنونی کی طرح دن رات پہاڑ کاٹنے میں مصروف ہوا۔ کبھی کبھی عشق کے جذبے سے سرشار ہوکر شیریں کے مجسمے کے پاؤں پر بوسہ دیتا، نالہ وفریاد کرتا اور پھر پہاڑ کاٹنے میں جٹ جاتا۔

جب شیریں تک یہ خبر پہنچی کہ فرہاد اس کے عشق میں دیوانہ ہوگیا ہے اور اسی پاداش میں خسرو نے اسے ایک ایسے کام پر معمور کیا ہے جس میں اس کی جان جاسکتی ہے تو وہ فرہاد سے ملنے گئی۔ اسے دودھ کا ایک پیالہ دیا اور جب واپسی کے لئے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی تو اچانک گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ قبل اس کے کہ شیریں گھوڑے سے گرتی، فرہاد نے اسے گھوڑے سمیت اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور اسی طرح اسے محل تک بعافیت پہنچادیا۔

پھر خسرو تک شیریں اور فرہاد کی ملاقات کی خبر پہنچی۔ اسے یہ اطلاع بھی ملی کہ فرہاد جذبہ ''عشق سے سرشار ہوکر دن رات پہاڑ کاٹنے میں جٹا ہوا ہے۔ اسے تشویش ہوئی کہ اگر وہ اسی رفتار سے پہاڑ کاٹتا رہا تو آمدورفت کا راستہ تعمیر کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوجائے گا۔ مشیرانِ سلطنت نے اسے صلاح دی کہ اگر وہ فرہاد تک یہ خبر پہنچادے کہ شیریں کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ اس سانحے کی تاب نہ لاکر خود ہی جان دے دیگا۔ چنانچہ ایک قاصد کے ذریعہ فرہاد تک شیریں کی موت کی جھوٹی خبر پہنچائی گئی۔ خبر سن کر فرہاد نے پہاڑ سے چھلانگ لگائی، آہ وزاری کی اور پھر زمین کو بوسہ دے کر دم توڑ دیا۔ عام روایت یہ ہے کہ شیریں کی موت کی خبر سن کر فرہاد نے اپنے سر پر تیشہ مار لیا تھا اور اس طرح

اس کی موت واقع ہوئی۔

جہاں تک فرہاد کا تعلق ہے تو داستانِ خسرو شیریں میں اس کا کردار اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے مگر داستان آگے بھی چلتی ہے۔ خسرو کی بیوی مریم کا انتقال ہونے کے بعد خسرو اور شیریں کی شادی ہوتی ہے۔ پھر مریم کے بطن سے پیدا ہوا خسرو کا بیٹا شیرویہ اپنی سوتیلی ماں پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے اپنے باپ خسرو پرویز کا خون کر دیتا ہے۔

خود بادشاہ بننے کے بعد شیرویہ اپنی سوتیلی ماں، شیریں سے خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔ شیریں بظاہر راضی ہوتی ہے لیکن جس دن خسرو کی لاش دفنائی جاتی ہے تو خود کو اس کے مقبرے میں مقید کر کے ایک خنجر سے اپنا سینہ چیر کر اپنے محبوب کی لاش سے لپٹ جاتی ہے۔

جم: جم کا تعلق اس دورِ قدیم سے ہے جب آریائی نسل کے لوگ مشرقِ وسطیٰ سے نکل کر ایران میں مقیم ہوئے تھے اور ابھی ان کی آمد ہندوستان میں نہیں ہوئی تھی۔ جم کے ساتھ جو کلمہ 'شید' ملحق ہوتا ہے اسکے لغوی معنی بزرگ، روشن اور جلیل کے ہیں۔ خورشید بھی اسی قسم کا لفظ ہے۔

ایرانی ادب میں جم یا جمشید مختلف ادوار میں مختلف شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ اگر عیش و عشرت، سرور و رقص اور مئے خواری کے ضمن میں جم کا استعمال ہوا ہو تو اس سے مراد قدیم افسانوی بادشاہ جمشید ہو گی جسے ضحاک نے شکست دی تھی۔ فردوسی نے اسے "شاہنامہ" میں پیشدادی سلسلے کا چوتھا بادشاہ بتایا ہے۔ "شاہنامہ" کے مطابق جم نے سات سو سال تک حکمرانی کی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ حیوانات، جن و پریاں اور شیاطین بھی اسکے زیرِ نگیں تھے۔ اس کا دور انسانی تمدن و ترقی کا اولین دور تھا۔ اسی کے دور میں پہلی بار جنگی اسلحہ جات ایجاد ہوئے، کھیتی باڑی کی ابتداء ہوئی، بحری جہازوں کا استعمال، ملاحی اور غوطہ خوری کی شروعات بھی جم کے دور میں ہی ہوئی۔

بعض ایرانی روایات میں حضرت سلیمانؑ کو بھی جمشید کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر جم کے ساتھ انگشتری، خاتم، اہرمنِ حکومت، تختِ سلیمان وغیرہ کا ذکر آئے تو مراد حضرت سلیمانؑ ہو گی۔

جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا تو ایرانیوں کی حمیت اور غیرت کو سخت چوٹ لگی۔ اس ذلت کے داغ کو ہلکا کرنے کیلئے انہوں نے سکندر اعظم کو بھی جمشید کا لقب دے دیا۔ جہاں بھی جمشید کے ساتھ دارا، آئینہ وغیرہ کا استعمال ہو گا تو مراد سکندر اعظم ہو گی۔

ایرانی اور اردو شعری روایات میں جامِ جم یا ساغرِ جم بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ جمشید کے شراب پینے کا پیالہ جامِ جم کہلاتا ہے جسے بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ روایت کے مطابق اس کے اندر سات خطوط کھنچے ہوئے تھے جن کی ترتیب اس طرح تھی۔ خطِ جور، خطِ بغداد، خطِ بصرہ خطِ ارزق، خطِ درشکر، خطِ کاسہ گر اور خطِ فردونیہ۔ بعض روایتوں میں آخری دو خطوط کے نام خطِ اشک اور خطِ ساگر بھی آئے ہیں۔ ایک طرح سے یہ خطوط اس زمانے کے معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے مظہر تھے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جام جم میں شراب پہلے خط تک بھری ہو تو اسے سوائے بادشاہ کے اور کوئی نہیں پی سکتا تھا۔ دوسرے خط تک بھری ہو تو شاہی خاندان کے افراد ہی پی سکتے تھے، اس کے بعد اعیانِ حکومت اور امرا کا نمبر آتا تھا۔ اس طرح بتدریج ہر طبقے کے لئے ایک خط مخصوص تھا۔ اس جام کے تعلق سے یہ روایت بھی عام ہے کہ اس کے اندر کھنچے ہوئے خطوط کی مدد سے جمشید تمام دنیا کے حالات کا نظارہ کر سکتا تھا اور اسی مناسبت سے اس پیالے کو جامِ جہاں بیں بھی کہا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسی قسم کا ایک پیالہ کَے خسرو کا جام تھا جو کیانی سلسلے کا بادشاہ تھا اور اردو فارسی کی روایتوں میں اس پیالے کو جامِ کَے خسروی کہا جاتا ہے۔

تلمیح ۱۸ : سودا

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
(سودا کی زمین میں فیض کی غزل کا مطلع، ص ۴۵)

سودا کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ ان کے سنینِ ولادت و وفات متنازعہ ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور مالک رام ان کا سنِ ولادت ۱۷۰۶ء بتاتے ہیں اور تاریخ وفات ۲۷ / جون ۱۷۸۱ء جب کہ ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق کی روشنی میں سودا کی ولادت ۱۷۱۳ء میں بمقام دہلی ہوئی اور ۲۶ رجون ۱۷۸۰ء کو لکھنو میں انتقال کیا۔

سودا کے والد مرزا محمد شفیع تجارت کے سلسلے میں دہلی آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ سودا کو والد کی وفات کے بعد جو ترکہ ملا اسے انہوں نے تھوڑے دنوں میں کھاپی کر برابر کر دیا اور ملازمت اختیار کرلی۔ چنانچہ میر نے 'نوکر پیشہ' اور قائم نے 'مصاحب پیشہ' لکھا ہے۔ سودا بچپن ہی سے نہایت ذہین اور موزوں طبع تھے۔ کچھ مدت تک شاہ حاتم کے شاگرد رہے۔ سودا نے میر کے برخلاف پہلے

فارسی میں شاعری شروع کی اور اس کے بعد خان آرزو کے کہنے پر اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ سودا میں شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ جیسے ہی وہ فارسی سے اردو کی طرف آئے۔ ان کے جوہر چمک اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری کی شہرت دہلی سے نکل کر دور دراز تک پھیلنے لگی۔ شاعری کے علاوہ سودا کو کتے پالنے اور موسیقی کا بھی شوق تھا۔

سودا مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ نومبر ۱۷۵۹ء میں عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد جب احمد شاہ ابدالی کے آنے کی خبر گرم ہوئی اور عماد الملک دہلی چھوڑ کر سورج مل جاٹ کے پاس چلا گیا تو سودا بھی اس کے ساتھ دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کی شاعری کا شہرہ سن کر نواب شجاع الدولہ نے انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ اس طرح وہ ۱۷۷۱ء میں شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے اور لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔

سودا نے متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ رباعیاں، مستزاد، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس سب کچھ کہا لیکن ان کے زور بیان کے جوہر قصیدہ گوئی میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اس صنف میں ان کا مرتبہ اردو شاعری میں سب سے بلند ہے۔ ان کے قصائد شوکتِ الفاظ، تازگیٔ مضامین، بلند خیالی، بندش کی چستی اور جدتِ تراکیب کی وجہ سے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ہجو گوئی میں بھی سودا نے اپنے مزاج کی شگفتگی اور افتادِ طبع کو برتا ہے۔

تلمیح ۱۹ : لیلیٰ ؎

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
(نظم ''دو عشق'' کا دوسرا حصہ، ص ۴۹)

یہاں بھی لیلائے وطن کا استعارہ محبوبہ و معشوقہ کے معنی دیتا ہے اور لفظ لیلیٰ کے یہ مرادی معنی داستانِ لیلیٰ مجنوں کے سبب ہی سے ہے۔ (داستان لیلیٰ مجنوں کیلئے دیکھئے تلمیح ۱۶)

تلمیح ۲۰ : لیلیٰ ؎

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
(غزل کا پانچواں شعر جو قطع بند کا دوسرا شعر ہے، ص ۵۶)

(داستانِ لیلیٰ مجنوں کیلئے دیکھئے تلمیح ۱۶)

تلمیح ۲۱: ایرانی طلبہ۔

(نظم "ایرانی طلبہ کے نام" جوامن وآزادی کی راہ میں کام آئے، ص ۵۹)

فیض کی اس نظم کا پس منظر ایران کی جدید تاریخ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی جب مختلف صورتوں میں ایران کے اندرونی معاملات میں مغربی طاقتوں کی مداخلت جاری رہی تو ایرانی طلباء اس کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے، مظاہرے کیے، گولیوں کا نشانہ بنے اور شہید ہوئے۔ فیض کی یہ نظم انہی طلباء کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔ نظم کے سیاق وسباق کی تشریح کے لئے ضروری ہے کہ ایران کی جدید تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

سولہویں صدی عیسوی سے ایران میں یورپی تاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ تاجر ایران کے سیاسی معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔ سولہویں صدی کی شروعات ہی میں برطانوی تاجروں نے ایران میں اپنی منڈیاں قائم کرلی تھیں اور نادر شاہ کے دور تک پہنچتے پہنچتے ایرانی معیشت پر برطانوی پکڑ مضبوط ہوگئی۔ ایران میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین نے تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی اور اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلئے برطانیہ نے پہلی بار ۱۷۵۶ء میں اپنا جنگی جہاز ایچ۔ ایس ہورس خلیج فارس میں لنگر انداز کیا۔ نتیجتاً ۱۷۸۳ء میں بحرین (جو ایران ہی کا حصہ تھا) پر سے ایرانی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور وہ برطانوی نوآبادی بن گیا۔

شمال۔ مشرقی ایران میں روسیوں کی مداخلت جاری تھی اور وسطِ ایشیا کے کئی علاقے جو کبھی ایران کے قبضے میں تھے سولہویں صدی کے آتے آتے روس کے قبضے میں چلے گئے۔ ان معنوں میں برطانیہ اور روس سولہویں صدی کی شروعات ہی سے ایرانی سیاست پر حاوی رہے۔ دونوں یورپی طاقتوں نے نہ صرف اپنی تجارتی منڈیاں قائم کیں بلکہ ایران کے کئی علاقوں میں اپنے فوجی اڈے بھی قائم کئے۔ حکومت پر ایرانی حکمرانوں کا اقتدار برائے نام تھا اور یہی صورتحال بیسویں صدی کے وسط تک قائم رہی۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک ایرانی معیشت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اب ایک اور مغربی طاقت یعنی امریکہ نے ایرانی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکہ اور سوویت روس کے مابین سرد جنگ کی شروعات ہو چکی تھی اور امریکہ ایران سے سوویت روس کو بے

دخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں امریکہ نے اپنے چار نکاتی پروگرام کے تحت ایران کو پچیس ۲۵ ملین ڈالر بطور قرض دیئے اور اس طرح ایرانی سیاست میں مداخلت کے لئے راہ بنائی۔

ایرانی عوام مغربی سامراجیوں اور ان کے ناپاک ارادوں سے سخت نالاں تھے۔ ایران کے تیل کے کنوؤں پر ایک برطانوی کمپنی (اینگلو۔ ایرانین آئیل کمپنی) کا قبضہ تھا، جو حقِ ملکیت کے معاوضے کے بطور بہت ہی قلیل رقم ایرانی حکومت کو دیتی تھی۔ عوامی قائدین، جن میں ڈاکٹر مصدق پیش پیش تھے، چاہتے تھے کہ مغربی تجارتی کمپنیوں کے اختیارات ختم کئے جائیں۔ امریکی قرض کے جواب میں سوویت روس نے بھی ایران سے بیس ملین ڈالر کا ایک تجارتی معاہدہ کیا جو نتیجہ تھا ڈاکٹر مصدق کی کوششوں کا۔ عوام میں ڈاکٹر مصدق کی مقبولیت بڑھنے لگی اور وہ ملک کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے اینگلو۔ ایرانین آئیل کمپنی کو قومی ملکیت قرار دیا۔ جواباً برطانوی حکومت نے یہ معاملہ بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کیا۔ بین الاقوامی عدالت نے فیصلہ سنایا کہ تیل کے تنازعے کو حل کرنے میں اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور کمپنی کو قومیائے جانے کا فیصلہ ایرانی حکومت کا نجی معاملہ ہے۔

اس کے بعد امریکہ اور برطانیہ نے ڈاکٹر مصدق اور ان کی سیاسی جماعت (تودہ) کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ جون ۱۹۵۳ء میں امریکی صدر آئزن ہاور نے دھمکی دی کہ اگر ڈاکٹر مصدق کی سرکار قائم رہی تو امریکی امداد بند کردی جائے گی۔ برطانیہ اور امریکہ نے ان ایرانی قائدین کو عوام میں مقبول کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جو ڈاکٹر مصدق اور ان کے سیاسی جماعت کے مخالف تھے۔ رضا شاہ پہلوی گو ملک کے آئین کے مطابق ایران کے بادشاہ تھے لیکن پارلیمانی نظامِ جمہوریت کے پیش نظر اصل اختیارات وزیر اعظم یعنی ڈاکٹر مصدق کے ہاتھوں میں تھے۔ رضا شاہ پہلوی بھی ڈاکٹر مصدق اور ان کی کمیونسٹ جماعت کے سخت مخالف تھے۔ تاہم عوام میں ان کی مقبولیت کے پیش نظر وہ انھیں وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں نے رضا شاہ پہلوی کی مدد کی۔ ملک میں انتشار اور تشدد کا ماحول بنایا گیا اور اسے بہانہ بنا کر رضا شاہ پہلوی نے اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم کے عہدے سے معزول کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف ایرانی عوام اور خصوصاً طلباء نے رضا شاہ پہلوی اور ان کے مغربی سرپرستوں، برطانیہ اور امریکہ کے خلاف کئی مظاہرے کئے جنہیں ایرانی فوج نے مغربی سامراجیوں کی مدد سے کچل دیا۔

ڈاکٹر مصدق کی سیاست قومی جذبات اور اشتمالی عقائد کا مرکب تھی اور انھیں ایرانی نوجوان نسل کی حمایت حاصل تھی۔ ان کی حمایت میں ایرانی طلباء ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی معزولی کے خلاف مظاہرے کرتے ہوئے ہزاروں طلباء پولس اور فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ فیضؔ کی نظم ڈاکٹر مصدق کے انہی نوجوان حمایتیوں کے نام ہے۔

تلمیح ۲۲: سعدیؔ ؎

کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
(نظم "نثار میں تری گلیوں کے......" ص ۶۵)

فیضؔ نے حاشیے میں نشاندہی کردی ہے کہ نظم کا مندرجہ بالا مصرعہ سعدیؔ شیرازی کے مصرعے "سنگ ہارا بستند و سگاں را کشادند" کا اردو ترجمہ ہے۔

سعدیؔ کا اصل نام مصلح الدین تھا وہ ۱۲۱۳ء کے آس پاس ایران کے مردم خیز شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ ان کے تخلص سعدیؔ کے تعلق سے جدید ترین تحقیق یہ کہتی ہے کہ اسے انھوں نے سعد بن ابوبکر بن سعید بن زنگی کے نام پر اختیار کیا تھا۔

سعدیؔ کی تعلیم و تربیت بغداد میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے شمالی افریقہ کے کئی ممالک اور عراق کی سیاحت کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان بھی آئے تھے۔ وہ کئی دفعہ مکہ بھی گئے اور حج کا فریضہ ادا کیا۔ عرصہ دراز تک سیر و سیاحت میں مشغول رہنے کے بعد وہ ۱۲۵۰ء میں اپنے وطن شیراز لوٹے اور سعد بن ابوبکر کے دربار سے منسلک ہوئے۔ سعدیؔ کی دو تصانیف کو شہرتِ دوام مل چکی ہے۔ ایک "بوستان" (مثنوی) جس کا سالِ تصنیف ۱۲۵۷ء ہے اور دوسری "گلستان" (نثر) جو ۱۲۵۸ء میں مکمل ہوئی۔ "گلستان" میں سعدیؔ نے اپنے تجربات کا نچوڑ حکایتوں اور مقولوں کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔ سعدی کی نثر فارسی زبان کا شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ عرصہ دراز تک سعدی کی مندرجہ بالا دونوں کتابیں ایران اور ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں نصاب کا حصہ رہیں۔

فارسی شاعری میں سعدیؔ کی اہمیت غزلوں کی وجہ سے ہے۔ ان کی غزلوں میں عشقِ حقیقی کے بجائے عشقِ مجازی کا رنگ غالب ہے۔ اکثر جگہ معاملہ بندی اور جنسی کیفیات بھی نظم ہوئی ہیں۔ تاہم سعدیؔ کی غزلیں تمام شعری تقاضوں پر کھری اترتی ہیں۔

سعدیؔ کی شاعری سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ ان کے اسی اسلوب نے حافظؔ شیرازی سے لے کر جامیؔ تک کم وبیش تمام فارسی شعراء کو متاثر کیا۔ سعدیؔ نے قصیدے بھی لکھے جو مدحیہ بھی ہیں اور بعض ایسے بھی جن میں اخلاقی وعرفانی خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ سعدیؔ کا انتقال ۱۲۹۲ء کے آس پاس ہوا۔ شیراز میں دفن ہیں اور ان کا مقبرہ آج بھی سخنوروں کے لئے ایک زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔

تلمیح ۲۳ : حضرت ابراہیمؑ

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی
(نظم "نثار میں تری گلیوں کے......" کا چوتھا بند ص ۶۷)

فیضؔ ہمیشہ محبت اور صحت مند اقدار کے مبلغ رہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں ہر وقت حق و باطل آپس میں برسرِ پیکار رہے لیکن بالآخر حق ہمیشہ باطل پر فتح پاتا رہا۔ اس نکتے کو بیان کرنے میں فیضؔ نے مندرجہ بالا بند میں اسلامی تاریخ سے حضرت ابراہیمؑ کی مثال پیش کی ہے۔ بند کے تیسرے مصرعے میں 'آگ میں پھول' کا جزوِ مصرعہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ گذرنے والے معجزاتی واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

قرآنِ مجید میں نہ صرف ایک مکمل سورۃ حضرت ابراہیمؑ کے نام سے معنون ہے بلکہ مزید سترہ سورتوں میں جگہ جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش یا اس سے قبل کے واقعات کا ذکر گو قرآن مجید میں نہیں ہے لیکن "قصص الانبیاء" میں ان واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس کی تلخیص یہاں پیش کی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں بابل اور عراق کے علاقوں پر ایک انتہائی جابر بادشاہ نمرود کی فرمانروائی تھی جو خدائی کا دعویدار بھی تھا۔ سامی روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی ولادت سے قبل اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک ستارہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی روشنی بڑھنے لگی۔ بالآخر وہ اس قدر روشن ہو گیا کہ آفتاب کی روشنی بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ معبروں نے نمرود کے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ

بہت جلد اس کی سلطنت میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو آگے چل کر انتہائی عظیم اور عالی مرتبت انسان بنے گا اور نمرود کی ظالمانہ حکومت اور جھوٹی شان و شوکت کو برباد کردے گا۔ یہ تعبیر سن کر نمرود نے حکم جاری کیا کہ آئندہ بارہ مہینوں میں اس کی سلطنت میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کردیا جائے۔ تاہم حضرت ابراہیمؑ کی ولادت خالقِ حقیقی کی مرضی و منشاء سے ہوئی تھی اسی لئے نمرود کے مخبر اور سپاہی انھیں گزند نہ پہنچا سکے اور ان کی پرورش ایک غار میں ہوئی۔ خدا کی قدرت سے وہ بہت جلد سیانے ہوگئے۔

اس کے آگے کے واقعات کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی۔ وہ بت پرستی کے سخت خلاف تھے کیونکہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ بت نہ تو سن سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کی پرستش سے کسی کو کوئی نفع ہوسکتا ہے۔ ان کے والد کا نام آذر تھا جو ایک بت تراش تھا اور بت پرستی ہی اس کا مذہب تھا۔ آذر نے حضرت ابراہیمؑ کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ ہر روز اس کے بنائے ہوئے بتوں کو بازار میں بیچیں۔ حضرت ابراہیمؑ بتوں کے پاؤں میں رسی باندھ کر انھیں نہایت حقارت سے گھسیٹتے ہوئے بازار لے جاتے اور لوگوں سے کہتے ''لو خریدو، ایسی چیز کون مول لیتا ہے جو کسی طرح کا نفع نہ دے بلکہ الٹا نقصان پہنچائے'' ظاہر ہے اس طرح کی باتیں سن کر کوئی بتوں کو نہ خریدتا۔ جب حضرت ابراہیمؑ گھر لوٹتے اور ان کا باپ بتوں کے نہ بکنے کے تعلق سے استفسار کرتا تو وہ اسے بھی اسی طرح کا جواب دیتے جیسا گاہکوں کے سامنے بیان کیا تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ہدایت کی کہ وہ کافروں کے سامنے دینِ حق کا پیغام رکھیں اور انھیں بت پرستی اور کواکب پرستی سے باز رکھیں تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے باپ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن آذر پر ان کی دعوت دینِ حق کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ الٹا اس نے حضرت ابراہیمؑ کو دھمکایا کہ اگر وہ اسی طرح بتوں کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے رہے تو وہ انھیں سنگسار کرادے گا۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کنارہ کشی اختیار کی کیونکہ باپ کے احترام سے زیادہ حمایتِ حق اور اطاعتِ الٰہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم میں تبلیغ شروع کی۔ انھیں بت پرستی اور کواکب پرستی سے باز رکھنے کے لئے دعوتِ حق دی لیکن لوگوں نے اپنے باپ دادا کے دین کو نہ چھوڑا۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں سے کہا کہ وہ ان بتوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔ اگر

بتوں میں کچھ طاقت ہے تو ان کا کچھ بگاڑ کر دکھائیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے کواکب پرستی کے خلاف بھی وعظ و نصیحت کی اور مضبوط و محکوم دلیلوں سے قوم کے سامنے ثابت کیا کہ تمام ستارے، ماہتاب و آفتاب قابل پرستش نہیں بلکہ لائقِ عبادت صرف اس خدائے واحد کی ذات ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے۔ لیکن جب ان روشن دلائل کے باوجود بھی قوم نے دعوتِ اسلام قبول نہ کی تو حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کے سامنے اعلانِ جنگ کرتے ہوئے کہا "اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔"

ایک دفعہ جب تمام افرادِ قوم اپنے مذہبی میلہ کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے نظامِ عمل کی تکمیل کے لئے سب سے بڑے دیوتا کے مندر گئے اور بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ پھر سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔ جب لوگ میلہ سے لوٹے اور اپنے بتوں کو ٹوٹا پھوٹا پایا تو بہت غصہ ہوئے۔ انھیں شک گذرا کہ ضرور یہ کام حضرت ابراہیمؑ کا ہوگا۔ قوم کے کاہنوں اور سرداروں نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو پکڑ کر لایا جائے۔ انھیں تمام افرادِ قوم کے سامنے لایا گیا اور جب ان سے سوال کیا گیا کہ انہوں نے بتوں کو توڑا پھوڑا ہے تو انہوں نے بتوں کی پول کھولنے کی غرض سے کہا "ان میں سے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے۔ پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہیں تو ان سے دریافت کرلو۔" اب حضرت ابراہیمؑ کی کی اس دلیل کا کاہنوں اور سرداروں کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بت نہ تو بول سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہی بات حضرت ابراہیمؑ پوری قوم کے سامنے ثابت کرنا چاہتے تھے۔ جب تمام افراد ندامت میں غرق تھے اور ان کے کاہن اور سردار ذلیل و رسوا ہو چکے تھے تو حضرت ابراہیمؑ نے پھر تمام افرادِ قوم کو دعوتِ اسلام دی۔ لیکن قوم راہِ راست پر نہ آئی بلکہ انھیں آگ میں جلانے کے منصوبے بنانے لگی۔ پھر انہیں بادشاہِ وقت نمرود کے سامنے پیش کیا گیا۔ نمرود کے ساتھ بھی حضرت ابراہیمؑ کا مناظرہ ہوا اور انہوں نے پھر ایک مرتبہ اپنی ٹھوس اور روشن دلیلوں سے ثابت کردیا کہ خدائی کے دعوے دار نہ تو بت ہو سکتے ہیں، نہ کواکب اور نہ خود نمرود کیونکہ ان سب کا خالقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن نمرود نے بھی راہِ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور فیصلہ سنایا کہ انہیں آگ میں ڈالا جائے۔ چنانچہ ایک مخصوص جگہ تعمیر کرنے کے بعد وہاں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی۔ جب آگ کے شعلے قرب و جوار کے چرند و پرند کو جھلسنے لگے تو حضرت ابراہیمؑ کو ایک گوپھن کے ذریعہ اس دہکتی آگ میں پھینکا گیا۔ آگ اسی وقت حضرت ابراہیمؑ کے حق میں "بردو سلام" بن گئی

یعنی سرد ہو گئی اور حضرت ابراہیمؑ کو سلامت رکھا۔ قرآن مجید میں آگ کے گلزار بن جانے کا ذکر نہیں ہے البتہ ''قصص الانبیاء'' میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تو آگ سرد ہو گئی اور وہاں پانی کا چشمہ بہہ نکلا۔ میوے دار درخت اور پھولدار پودے اُگ آئے'۔ (فیض نے اپنے مصرعے 'یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول' میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔)

جب اس معجزے کے بعد بھی نمرود اور اس کی رعایا راہ راست پر نہ آئی اور سوائے ان کی بیوی حضرت سارہؓ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے علاوہ کوئی بھی شخص ایمان نہیں لایا تو انہوں نے اپنے شہر ''فدان آرام'' سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے کلدانین پہنچے۔ جو دریائے فرات کے مغربی کنارے کے قریب ایک بستی تھی۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ماران گئے اور ''دینِ حنیف'' کی تبلیغ جاری رکھی۔ اسکے بعد فلسطین پہنچے۔ دوران سفر ان کے ساتھ حضرت سارہؓ، حضرت لوطؑ اور حضرت لوطؑ کی بیوی بھی تھیں۔ فلسطین سے شکیم (نابلس) پہنچے اور بالآخر مصر کی طرف سفر جاری رکھا۔

مصر پہنچنے سے قبل حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ حضرت سارہؓ کو مطلع کیا کہ اس ملک کا بادشاہ ایک جابر و ظالم شخص ہے۔ کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اسے زبردستی اپنے حرم میں داخل کر لیتا ہے اور اس کے شوہر کو قتل کر ڈالتا ہے۔ اگر عورت کے ساتھ کوئی دوسرا عزیز ہو تو اسے چھوڑ دیتا ہے۔ چونکہ اس سفر میں ان کے ہمراہ صرف حضرت سارہؓ تھیں اور سرزمین مصر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا مسلمان نہ تھا اس طرح سرزمین مصر میں صرف وہی ان کی دینی بہن تھیں۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؓ کو ہدایت دی کہ اگر بادشاہ مصر پوچھے تو کہہ دینا کہ تم میری بہن ہو۔ چنانچہ یہی ہوا اور جب بادشاہ نے حضرت سارہؓ کے ساتھ فعل بد کرنا چاہا تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے حضرت سارہؓ سے کہا کہ اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے۔ انھوں نے دعا کی اور اس کا ہاتھ درست ہو گیا۔ اس طرح تین مرتبہ بادشاہ نے فعلِ بد کا ارادہ کیا اور تینوں مرتبہ یہی قصہ پیش آیا۔ اب بادشاہِ مصر سمجھا کہ حضرت سارہؓ آدم زاد نہیں بلکہ جن ہیں۔ اس نے بہت سا اسباب اور اپنی بیٹی حضرت ہاجرہؓ کو بھی حضرت سارہؓ کی خدمت کرنے کیلئے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ کیا۔ حضرت ہاجرہؓ سے حضرت ابراہیمؑ کو پہلی اولاد یعنی حضرت اسمٰعیلؑ نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انھوں نے حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو چاہ زمزم کے قریب آباد کیا۔ اور انھیں سے اہل عرب کی

نسل چلی۔ بعد ازاں حضرت سارہؓ سے بھی حضرت ابراہیمؑ کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا یعنی حضرت اسحٰقؑ جن سے بنی اسرائیل کی نسل چلی۔

تلمیح ۲۴: لیلیٰ و شیریں ؎

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
(غزل کا چوتھا شعر، ص ۶۸)

لیلیٰ کے لئے دیکھئے تلمیح ۱۶ اور شیریں کے لئے دیکھئے تلمیح ۱۷

تلمیح ۲۵: غالبؔ ؎

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں
(مطلعِ غزل، ص ۷۹)

فیضؔ نے یہ غزل غالبؔ کی نذر کی ہے۔ غالبؔ کے لئے دیکھئے تلمیح ۱

زنداں نامہ

تلمیح ۲۶ : زنداں نامہ

فیض کے تیسرے شعری مجموعے کا نام جس میں شامل بیشتر تخلیقات ان کے دورِ اسیری کی یادگار ہیں۔ راولپنڈی سازش کیس میں فیض کی گرفتاری ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا۔ انکے بعض ناقدین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر فیض اس سازش کے سلسلے میں جیل نہ جاتے تو بطور شاعر کبھی اتنے مشہور نہ ہوتے۔ فیض نے دورانِ اسیری اپنے شعری سرمایے کی چند بہترین نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں اور وہ ایسا اس لئے کر پائے کہ وہ بے قصور تھے، ان کا ضمیر صاف تھا اور انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے دل و جاں پر ندامت کا بوجھ رہتا۔

راولپنڈی سازش کیس بجائے خود فیض، سجاد ظہیر اور پاکستان کے ترقی پسند عناصر کے خلاف ایک سازش تھی۔ مذہب کے نام پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا اور وہ بھی صرف قائدین کی مساعی کی وجہ سے۔ ان علاقوں کے عوام، جو بعد ازاں پاکستان کا حصہ قرار پائے، کبھی بھی ایک مذہبی مملکت کے قیام کے حق میں نہیں تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بنیاد پرست اور کٹر مذہبی قائدین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح پاکستان سے انسانی دوستی، رواداری اور ترقی پسندانہ روایات کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کے ترقی پسند اور انصاف پسند عناصر پر حملے شروع کئے گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی تنظیم قرار دیا گیا، 'اسلامی ادب' کا نعرہ بلند کر کے ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ مصنفین کی تضحیک و توہین کی گئی، راولپنڈی سازش کیس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس کے ذریعہ مذہبی قائدین نہ صرف فیض اور سجاد ظہیر کو بلکہ بعض سلجھے ہوئے خیالات کے فوجی افسروں کو بھی پھانسی پر لٹکانا چاہتے تھے۔

سازش کا پس منظر یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب امریکہ اور سوویت روس میں سرد جنگ کا آغاز ہوا تو امریکہ نے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثر کا سد باب کرانے کیلئے فوجی معاہدوں کی حکمت عملی شروع کی۔ قیام پاکستان کے بعد جب وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے امریکہ کا دورہ کیا تو امریکی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے پاکستان کو جنوب۔ مشرقی ایشیائی معاہدہ تنظیم (South East Asia Treaty Organisation/SEATO) اور وسطی معاہدہ تنظیم (Central Treaty Organisation/CENTO) کی رکنیت قبول کرنا پڑی اور اس طرح پاکستان امریکی بلاک میں شامل ہو گیا۔ اس وقت پاکستانی فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل اکبر خان تھے جنہوں نے ۱۹۴۸ء میں جنرل طارق کے نام سے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ اکبر خاں حکومت کی خارجہ پالیسی سے

ناخوش تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان دو بڑی طاقتوں کی سرد جنگ میں اپنے کو ملوث کرے۔ چونکہ معاہدوں کی رو سے پاکستان میں فوجی اڈوں کا قیام عمل میں آنا تھا اس لئے بحیثیت ایک فوجی افسر اکبر خاں اس نئی صورتحال سے ناخوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ اور سوویت روس کی سرد جنگ کسی بھی وقت حقیقی جنگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو سوویت روس کی پاکستان سے جغرافیائی قربت کی وجہ سے پاکستان کو بھاری نقصان پہنچے گا۔ سجاد ظہیر نہ صرف ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک تھے بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک فعال ممبر بھی تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پارٹی کو مستحکم کرنے کے لئے وہ پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا تھا اس لئے وہ روپوش ہو گئے۔ جنرل اکبر خاں سے سجاد ظہیر کے خاندانی مراسم تھے۔ روپوشی کے زمانے میں جنرل اکبر خاں نے فیض کی مدد سے سجاد ظہیر سے ملاقات کی اور یہ اطلاع دی کہ بہت جلد فوجی افسران پاکستانی حکومت کا تختہ پلٹنے والے ہیں جس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کو ملک کا انتظام سنبھالنا ہوگا۔ سجاد ظہیر نے یہ تجویز مسترد کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ کمیونسٹ پارٹی کا اثر و رسوخ بہت محدود ہے اور وہ اس موقف میں نہیں کہ بغاوت کے بعد حکومت کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ لیکن اکبر خاں مصر رہے کہ نئی حکومت کو قائم کرنے کیلئے پارٹی کے اراکین خود کو تیار کریں۔

پھر ایک دن اکبر خاں نے راولپنڈی میں ایک میٹنگ طلب کی جس میں فیض اور سجاد ظہیر کے علاوہ دس پندرہ فوجی افسران نے بھی شرکت کی۔ اس میٹنگ میں بغاوت کی کامیابی کے امکانات پر غور کیا گیا اور اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ بغاوت کیلئے حالات سازگار نہیں ہیں اسلئے معاملے کو وہیں ختم کیا جائے۔ راولپنڈی سازش کیس کی تفصیل ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے ایک مضمون "فیض بیتی" (مشمولہ "اردو ادب" فیض احمد فیض نمبر، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر نئی دہلی، ۱۹۸۵ء ص ۲۶ تا ۳۱) میں دی ہے۔ اکبر خاں کے گھر پر بلائی گئی میٹنگ کے تعلق سے خلیق انجم نے سازش میں ملوث ایک فوجی افسر ظفر اللہ پوشنی کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ ظفر اللہ پوشنی نے لکھا ہے کہ "فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات اس محفل میں ہوئی جو سابق چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل اکبر خان کے گھر پر ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی، اور جو بعد میں راولپنڈی مقدمہ سازش کی بنیاد بنی۔ اس میٹنگ میں جنرل صاحب نے حکومت کا تختہ الٹنے کی جو اسکیم پیش کی تھی اس کو حاضرین نے کئی گھنٹوں کے مباحثے کے بعد مسترد کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں حکومت نے وعدہ معاف گواہوں سے یہ جھوٹی گواہی دلوائی کہ میٹنگ میں شامل حضرات اور ان کے بعض دوسرے ساتھی حکومت پر قبضہ کرنے کی اسکیم پر متفق ہو گئے تھے۔"

(خلیق انجم، ایضاً، ص ۲۸) ایسا لگتا ہے کہ اس میٹنگ میں حکومت کے کچھ ایجنٹوں نے بھی شرکت کی تھی چنانچہ ایک ایجنٹ کرنل صدیق نے حکومت کو اطلاع کر دی۔ اس طرح ۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو فیض، سجاد ظہیر، میجر جنرل اکبر خاں، میجر جنرل وزیر احمد، محمد خاں جنجوعہ، بریگیڈیر لطیف، بریگیڈیر صدیق خاں اور محمد حسین عطا کو گرفتار کیا گیا۔

حکومت نے پہلے تو یہ طے کیا تھا کہ تمام سازشیوں کا کورٹ مارشل کر کے انھیں سزائے موت دی جائے۔ لیکن بعد میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ اور فیض دوسرے ملزمین کی جانب سے مقدمے کی پیروی کرنے والے وکیل حسین شہید سہروردی نے فیض اور اکبر خاں کو یہ روح فرسا خبر بھی سنائی کہ انھیں سزائے موت ہو سکتی ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس خبر کو سننے کے بعد بھی "فیض صاحب نے سگریٹوں کا پورا کوٹا پیا اور اپنی زندگی کی بہترین نظمیں لکھیں" (خلیق انجم، ایضاً، ص ۲۹ و ۳۰) بالآخر ۵ر جنوری ۱۹۵۳ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا اور فیض کو ڈھائی برس کی سزا ہوئی۔ سزا کے ڈھائی برس اور مقدمے کی سماعت کے دوران ایامِ اسیری کو ملا کر فیض اس مقدمے کے سلسلے میں کل چار سال ایک ماہ گیارہ دن جیل میں رہے۔ بعد ازاں ایوب خاں کے دورِ حکومت میں بھی انھیں دسمبر ۱۹۵۸ء میں گرفتار کر کے پانچ مہینوں تک قید میں رکھا گیا تھا۔

تلمیح ۲۸ : سودا۔

اے ساکنانِ کنجِ قفس ! صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو

'زنداں نامہ' کی شروعات میں سجاد ظہیر اور میجر محمد اسحاق کے دیباچوں کے بعد فیض نے سودا کا مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے۔ سودا کے لئے دیکھئے تلمیح ۱۸

تلمیح ۲۸ : حافظ شیرازی۔

یہ شعر حافظِ شیراز، اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیب عنبر دست

(نظم "اے حبیب عنبر دست" کے دوسرے بند کا پہلا شعر، ص ۵۲)

حافظ شیرازی کے حالات کیلئے دیکھئے تلمیح ۱۰

تلمیح ۲۹ : لاہور

(نظم "اے روشنیوں کے شہر" ص ص ۷۲ و ۷۳)

شہر لاہور سے متعلق اپنی یہ نظم فیضؔ نے دورانِ اسیری ۲۸ / مارچ ۱۹۵۴ء کو لاہور جیل میں شروع کی تھی۔ لیکن فوری بعد انھیں منٹگمری جیل منتقل کر دیا گیا اور اس طرح ۱۵/ اپریل ۱۹۵۴ کو یہ نظم منٹگمری جیل میں تکمیل پائی۔

لاہور عرصہ دُراز سے پنجاب میں تہذیب و ثقافت اور علم و دانش کا مرکز ہے۔ اقبالؔ اور فیضؔ دونوں کا مولد سیالکوٹ تھا۔ دونوں نے دنیا بھر کی سیاحت کی تھی۔ برصغیر کے کئی شہروں میں دونوں کو عوام سے بے پناہ محبت ملی تھی لیکن ان دونوں شعراء کے دل لاہور کے گلی کوچوں کے لئے ہمیشہ دھڑکتے رہے۔ وہ جہاں بھی رہے لاہور کی یاد انھیں ستاتی رہی۔

زمانہ اسیری میں ویسے بھی انسان کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتا ہے اور فیضؔ کے ساتھ تو یہ ہوا کہ وہ اپنے محبوب شہر میں تو موجود تھے لیکن سلاخوں کے پیچھے۔ ان کا دل اپنے عزیز و اقارب، اپنے دوستوں، اپنے مداحوں اور اپنے شہر کی لیلاؤں سے ملنے کے لئے تڑپتا رہا لیکن وہ قید و بند کے آگے مجبور تھے۔ یہ نظم فیضؔ کے اسی جذباتی انتشار کا نتیجہ ہے۔

برصغیر میں لاہور ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ ہندو اسطوری روایات کی رو سے اس شہر کی بنیاد رام چندر جی کے زمانے میں رکھی گئی تھی اور ان کے بیٹے لو کے نام پر اس شہر کا نام لاہور رکھا گیا تھا۔ تاہم اس روایت کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے کیونکہ سکندر اعظم نے جب ہندوستان پر فوج کشی کی تو اس کے ساتھ آنے والے مورخوں نے کہیں بھی لاہور کا تذکرہ نہیں کیا۔ لاہور کے قدیم کھنڈرات سے بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ شہر سکندر اعظم کے زمانے میں موجود تھا۔

مستند تاریخی ماخذات میں سب سے پہلے لاہور کا ذکر چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرنامے میں ملتا ہے جس نے ۶۳۰ء کے آس پاس اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لاہور پہلی صدی عیسوی اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی وقفے میں ایک بڑے شہر کی صورت میں ابھرا ہوگا۔

ابتداء میں خاندانِ اجمیر کے چوہان راجپوت اس شہر پر حکمرانی کرتے تھے۔ بعد ازاں محمود غزنی اور اس کے بعد محمد غوری نے اس پر قبضہ کیا اور اسے ہندوستانی فتح شدہ علاقے کا پایہ تخت بنایا۔ محمود غزنی اور محمد غوری کے زمانے میں لاہور میں کئی خوبصورت اور عالیشان عمارتیں تعمیر کی گئیں جن

کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ مغلیہ دورِ حکومت میں لاہور کی آبادی اور رونق میں بے حد اضافہ ہوا۔ ہمایوں سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مغل شہنشاہوں نے لاہور میں کئی عظیم الشان عمارتیں اور قلعے تعمیر کیے اور شہر کو خوبصورت باغات سے آراستہ کیا۔ اکبر نے لاہور قلعہ کو توسیع دے کر اس کی مرمت کروائی اور شہر پناہ تعمیر کی۔ لاہور کی عمارات قدیم میں زیادہ تر خوبصورت اور پرشکوہ عمارتیں جہانگیر اور شاہ جہاں کے دورِ حکومت کی یادگار ہیں۔ اورنگ زیب کی تعمیر کردہ بادشاہی مسجد کا شمار دنیا کی وسیع ترین مساجد میں ہوتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد لاہور پر سکھ حکمرانوں کا قبضہ ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے اپنی سلطنت کی راجدھانی بنایا۔ پھر انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پورے پنجاب بشمول لاہور کو اپنے قبضے میں لے لیا اور اس طرح لاہور برطانوی سامراج کے زیرِ نگیں چلا گیا۔

شہر پناہ کے اندر گھرے ہوئے پرانے لاہور میں پرانی دلی کی طرح تنگ اور پیچ دار گلیاں ہیں لیکن شہر پناہ سے باہر نیا لاہور آباد ہے جہاں کی پرشکوہ عمارتیں اور وسیع وعریض شاہراہیں برطانوی اور قیامِ پاکستان کے بعد کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاریخی اور فنِ تعمیری نقطہ نظر سے شہر کے دو اہم مقامات بھی شہر پناہ سے باہر واقع ہیں یعنی شاہدرا اور شالامار باغ۔ شاہدرا میں جہانگیر کا مقبرہ مغلیہ فنِ تعمیر کی خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔ شالامار باغ کو شاہ جہاں نے ۱۶۳۷ء میں تعمیر کروایا تھا۔ مغلیہ دور کے دوسرے باغات کی طرح یہ بھی فنِ تعمیر اور باغبانی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

پرانے لاہور کے علاوہ نئے شہر کے تین اہم مرکزی علاقے ہیں سول لائنز، انارکلی اور میاں میر کی چھاؤنی۔ سول لائنز کی مرکزی شاہراہ مال (Mall) کے نام سے موسوم ہے۔ برطانوی دور میں خصوصاً چارلس رواز کے دورِ لیفٹننٹ گورنرشپ (۱۹۰۷ء-۱۹۰۲ء) میں مال کے علاقے میں کئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی گئیں اور آج بھی یہ لاہور کا ایک بارونق علاقہ ہے۔

برطانوی دور میں لاہور شمال۔ مغربی ہندوستان کا اہم ترین علمی اور ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ لاہور میں متعدد کالج اور اسکول بھی ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل پنجاب، صوبۂ سرحد اور سندھ کے زیادہ تر طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے لاہور ہی کا رخ کرتے تھے۔ آج لاہور پاکستان کا اہم ترین علمی مرکز ہے۔

لاہور پاکستانی فلم انڈسٹری کا بھی مرکز ہے۔ درحقیقت قیام پاکستان سے قبل ہندوستانی فلم انڈسٹری کے دو اہم مراکز تھے۔ ممبئی اور لاہور۔ تقسیم ہند کے بعد بھی ان دونوں شہروں کی یہ خصوصیت

برقرار رہی۔ ثقافتی اور علمی نقطہ نظر سے پاکستان میں لاہور کی افضلیت اور اوّلیت مسلم ہے۔ اسی سبب فیض کو اس شہر سے جذباتی لگاؤ تھا۔ آج بھی پاکستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد لاہور ہی میں قیام پذیر ہے۔

تلمیح ۳۰: ایتھل اور جولیئس روزنبرگ۔

(نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" جو ان کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ ص ص ۷۶ تا ۷۸)

جولیئس روزنبرگ اور اس کی بیوی ایتھل یہودی نژاد امریکی شہری تھے جنہیں سوویت یونین کے لئے جاسوسی کرنے کے سلسلے میں موت کی سزا دی گئی تھی۔

جولیئس روزنبرگ ۱۲ رمئی ۱۹۱۸ء کو نیویارک میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک گارمنٹس فیکٹری میں مزدور تھا اور مزدوروں کی یونین کا بہت سرگرم رکن بھی تھا۔ روزنبرگ خاندان کی معاشی حالت بہت خستہ تھی۔ جولیئس کو ایک عبرانی اسکول میں داخل کیا گیا جہاں اس نے نصاب کی کتابوں کو چھوڑ کر توریت کا مطالعہ شروع کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے تک مذہبی امور میں جولیئس کی دلچسپی برقرار رہی۔ ایک دن اتفاقاً اس نے امریکی کمیونسٹ پارٹی کے ایک قائد کی تقریر سنی اور اس سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگوں میں حصہ لینا شروع کیا اور اس طرح مذہب کے بجائے سیاست اس کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے نیویارک کے سٹی کالج میں انجینیئرنگ کورس میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں کالج سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جولیئس طلباء کے کمیونسٹ گروپ کا سرگرم رکن بن گیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک دوائیوں کی دکان میں جز وقتی نوکری بھی کر لی۔ یہ دکان سیاہ فام امریکیوں کی گندی بستی میں واقع تھی۔ ایک رات ایک سفید فام بس ڈرائیور ایک سیاہ فام شخص کو کچل کر فرار ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر دوائیوں کی دوکان میں لے آئے۔ وہ لہولہان تھا۔ ایمبولینس کے لئے فون کیا گیا لیکن جب تک ایمبولینس پہنچتی اس سیاہ فام شخص نے دم توڑ دیا۔ اس کے بعد دوکان کے فرش سے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے جولیئس نے قسم کھائی کہ وہ اس "جرم" کو کبھی نہیں بھولے گا۔ اس زمانے میں صرف امریکی کمیونسٹ پارٹی سیاہ فام افراد کے حقوق کی بحالی کیلئے آواز اٹھاتی تھی۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں جولیئس نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔

ایتھل جس کے خاندان کا نام گرین گلاس تھا، ۲۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو نیو یارک ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا خاندان بھی مفلوک الحال تھا۔ اس کی ماں ٹیسی گرین گلاس نہیں چاہتی تھی کہ ایتھل تعلیم حاصل کرے۔ بچپن ہی سے اسکی ماں نے اسے دو چھوٹے بھائیوں ڈیوڈ اور برنی کی دیکھ بھال پر مامور کیا تھا۔ پھر بھی ایتھل تعلیم حاصل کرتی رہی۔ وہ ایک ذہین اور محنتی طالبہ تھی۔ ایتھل کا باپ، بارنی، سلائی مشینوں کی مرمت کر کے تھوڑا بہت کما لیتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ایتھل کو ساتھ لے کر یہودیوں کے تھیٹر جایا کرتا تھا جہاں یدش (Yiddish) زبان میں ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے ایتھل کے دل میں ایک اداکارہ اور گلوکارہ بننے کی خواہش جاگی۔ ۱۹۳۱ء میں ایتھل نے اسکول کی تعلیم مکمل کی اور ایک کمپنی میں کلرک کی نوکری کر لی۔ رات میں وہ غیر پیشہ ور تھیٹر کے ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ پھر گلوکاری کے ایک مقابلے میں اسے دوسرا انعام ملا یعنی ۲ امریکی ڈالر۔ وہ گانے کی مشق کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں اس بات کے خلاف تھی۔ جیسے تیسے ایتھل نے ایک ٹوٹا پھوٹا پیانو حاصل کیا اور گلوکاری کی تربیت جاری رکھی۔ ۱۹۳۵ء میں ایتھل کو اسکولا کینٹورم (Schola Cantorum) نامی ایک میوزیکل گروپ میں نوکری مل گئی۔ اسی سال گروپ کے فنکاروں نے ہڑتال کی، ایتھل بھی ہڑتال میں شامل تھی۔ کمپنی کے اعلیٰ عہدے داروں نے ہڑتال ختم کرانے کے لئے کرایے کے غنڈے بھیج کر فنکاروں پر حملہ کروایا۔ ایتھل بھی اس حملے میں زخمی ہوئی اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ کمیونسٹوں کا نقطہ نظر درست ہے۔ پھر ایتھل نے دوسری کمپنی میں نوکری کر لی۔ اسے اکثر سیاسی اور سماجی تقریبوں میں گانے کی دعوت دی جاتی۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں جب اس نے انٹرنیشنل سی مینس یونین (International Seamen's Union) کی ایک تقریب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو وہاں اس کی ملاقات جولیئس سے ہوئی۔ اس وقت ایتھل کی عمر اکیس سال تھی اور جولیئس اٹھارہ سال کا تھا۔ دونوں میں عشق ہوا اور ۱۸ جون ۱۹۳۹ء کو دونوں نے شادی کر لی۔

اس کے بعد ایتھل کو محکمہ مردم شماری (Cansus Bureau) میں ملازمت مل گئی جس کیلئے انھیں واشنگٹن ڈی۔ سی منتقل ہونا پڑا۔ جولیئس بھی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ بالآخر اسے فوج میں جونیئر انجینیئر کی نوکری مل گئی۔ ایتھل اپنی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد نیو یارک لوٹ آئی۔ جولیئس کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہت سے دورے کرنے پڑتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتا لوگوں کو کمیونسٹ پارٹی کا رکن بننے کی تبلیغ کرتا۔ ۱۹۴۰ء کے اختتام تک وہ یہ کام علی الاعلان کرتا رہا۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں فوجی حکام نے اسے سماعتِ وفاداری (Loyalty Hearing) کے سلسلے میں طلب کیا۔ اسی سلسلے میں اسے ۸ر مارچ ۱۹۴۱ء کو دوبارہ طلب کیا گیا۔ دونوں سماعتوں کے دوران اس نے جھوٹ بیان دیا کہ اس کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد جولیس نے خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں امریکہ دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوا۔ اب امریکہ اور سوویت یونین جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ اس دوران ایتھل کو بھی ملازمت مل گئی اور ان کے معاشی حالات کچھ بہتر ہوئے۔ ۱۰ر مارچ ۱۹۴۳ء کو ان کا پہلا بیٹا، میخائیل پیدا ہوا۔ ۱۹۴۵ء کی شروعات میں فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (FBI) نے جولیس کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم کئے اور ۹ر فروری ۱۹۴۵ء کو اسے غیر معیّنہ مدت کے لئے معطل کیا گیا۔ تاہم جولیس فوج کے دوسرے شعبے میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر امریکہ میں فوجی اخراجات میں بھی تخفیف کی گئی اور جولیس کو ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ جولیس نے اپنے برادرِ نسبتی ڈیوڈ گرین گلاس کے اشتراک میں نیویارک میں ایک چھوٹی سی ورک شاپ شروع کی۔ لیکن کاروبار میں ترقی نہ ہو سکی اور روزنبرگ فیملی کو پھر ایک بار معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۴ر مئی ۱۹۴۷ء کو ان کا دوسرا بیٹا رابرٹ پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے فوری بعد امریکہ میں کمیونزم مخالف لہر شروع ہوئی۔ ۱۹۴۶ء کے صدارتی انتخابات سے قبل امریکی چیمبر آف کامرس نے ۳۸ صفحوں کا ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا 'امریکہ میں کمیونسٹوں کا خفیہ داخلہ' بعد میں اس پمفلٹ کو توسیع دے کر جنوری ۱۹۴۷ء میں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی ایک قانونی تنظیم تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے آتے آتے کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد پر مقدمے دائر کئے جانے لگے۔ لفظ 'کمیونسٹ' کو روسی جاسوس کا متبادل سمجھا جانے لگا۔ ۱۹۵۰ء کے داخلی دفاعی قانون کی رو سے نہ صرف عملی سیاست بلکہ سیاسی عقائد بھی غیر قانونی قرار پائے۔

۱۷ر جولائی ۱۹۵۰ء کو جولیس کو گرفتار کیا گیا۔ اسی سال ۷ر اگست کو ایتھل کو مزید تفتیش کے لئے بلایا گیا اور ۱۱ر اگست کو اسے بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ایف بی آئی (FBI) نے تحقیقات کی شروعات اس وقت کی جب انھیں ایک روسی جاسوس کی ڈائری میں کلاز فکس (Klaus Fuchs) کا نام نظر آیا۔ ڈاکٹر فکس ایک جرمن نژاد برطانوی شہری تھا۔ ۱۹۴۳ تا ۱۹۴۶ء اس نے برطانوی اور امریکی سائنسدانوں کے ساتھ ایک خفیہ پروگرام مین ہٹن پروجیکٹ (Manhattan Project) پر کام کیا

تھا۔ اس پروجیکٹ کو لاس الاموس (Los Alamos)، نیو میکسیکو کے مقام پر شروع کیا گیا تھا اور اس کی تکمیل پر ایٹم بم کی دریافت ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر فکس کو گرفتار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ وہ ایٹم بم کے تعلق سے روس کو معلومات فراہم کرتا رہا ہے۔ فکس کے ذریعہ ایف۔ بی۔ آئی ایجنٹوں نے فلاڈلفیا (Philadelphia) کے ایک بائیو کیمسٹ ہیری گولڈ کو گرفتار کیا۔ ہیری گولڈ نے بتایا کہ اسے ایٹمی بم سے متعلق ڈیزائن ڈیوڈ گرین گلاس سے ملے تھے۔ ڈیوڈ گرین گلاس ایتھل کا چھوٹا بھائی اور جولیس کے بزنس میں شریک کار تھا۔ جولیس کی شخصیت سے وہ بہت متاثر تھا اور اسی اثر کے تحت وہ بھی کمیونسٹ بن چکا تھا۔ اس نے FBI کو بیان دیا کہ اس پوری سازش کا سرغنہ جولیس ہے۔ اسطرح پہلے جولیس اور بعد ازاں ایتھل کو گرفتار کیا گیا۔ ۵/ مارچ ۱۹۵۱ء کو اس مقدمے کی سماعت شروع ہوئی اور اکتیس دن کی سماعت کے بعد ۵/ اپریل ۱۹۵۱ء کو جج ارونگ کاف مین (Kaufmen) نے ایتھل اور جولیس کو سزائے موت سنائی۔

یورپ اور امریکہ میں کئی مقامات پر اس فیصلے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ جولیس اور ایتھل روزنبرگ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور انھیں بے جا طور پر سزائے موت سنائی گئی۔ کئی معزز ہستیوں بشمول عظیم سائنسدان البرٹ آئنسٹائن اور پوپ پیس (۱۲) نے ان کی سزا منسوخ کرنے کی اپیل کی۔ فیصلے کے خلاف امریکی سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی لیکن وہاں بھی سزائے موت برقرار رہی۔ پھر امریکی صدر ڈوائٹ ڈی ایزن ہور سے دو مرتبہ معافی کی درخواست کی گئی لیکن وہاں بھی اپیل مسترد ہوگئی۔ بالآخر ۱۹/ جون ۱۹۵۳ء کو نیویارک کے سنگ سنگ جیل میں دونوں کو برقی کرسی پر بٹھا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ڈیوڈ گرین گلاس کو پندرہ برس قید کی سزا ہوئی۔ اسے ۱۹۶۰ء میں رہا کردیا گیا۔

ترقی پسند تحریک نظریاتی طور پر اشتمالیت سے متاثر تھی اور اس سے متعلق بیشتر شعراء و ادباء بشمول فیض سوویت یونین کی طرز حکومت کے دلدادہ تھے۔ روزنبرگ مقدمے کے سلسلے میں سوویت یونین کا موقف یہ تھا کہ ایتھل اور جولیس بے قصور تھے اور انھیں ناحق سزائے موت دی گئی۔ فیض بھی اسی بہاؤ میں بہہ گئے جس کا نتیجہ ان کی یہ نظم ہے تاہم نکیتا خرد شچوف کی سوانح عمری (جو ۱۹۹۰ء میں بعد از مرگ شائع ہوئی) کی تیسری جلد میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ جولیس اور ایتھل دونوں سوویت یونین کے لئے جاسوسی کرتے تھے اور انہوں نے ایٹم بم کے متعلق خفیہ معلومات روس کو فراہم کی تھیں۔

تلمیح ۳۱: مسیحا ؎

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خون کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لئے

(نظم ''دریچہ'' کا پہلا بند، ص ۸۲)

دیکھئے تلمیح ۱۲

تلمیح ۳۲: کینیا کے حریت پسند ؎

(نظم Africa Come Back، ایک رجز، ص ص ۸۸و۸۹)

فیضؔ نے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے کہ نظم کا عنوان افریقی حریت پسندوں کا نعرہ ہے۔ ۱۴/ جنوری ۱۹۵۵ء کو جب یہ نظم مکمل ہوئی تو کینیا میں حریت پسند اپنے ملک کی آزادی کے لئے برطانوی سامراج سے برسرِ پیکار تھے اور فیضؔ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں منٹگمری جیل میں بند۔ قید و بند کی مصیبتوں کے باوجود فیضؔ اپنے ذاتی مصائب کا ماتم کرنے کے بجائے دنیا بھر کے مظلوم ومحکوم انسانوں کی نجات کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ ان کے اسی عالمی وژن نے انھیں اردو میں اقبالؔ کے بعد سب سے اہم شاعر بنایا۔ اپنے نامساعد حالات سے بے پرواہ ہو کر ایک پچھڑے ہوئے ملک کا یہ بالغ نظر شاعر کینیا کے حریت پسندوں کی آواز میں آواز ملا کر رجز گا رہا تھا۔ ''آ جاؤ افریقا''

کینیا، افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انسانی ارتقاء کے اولین سراغ افریقہ بشمول کینیا میں ملتے ہیں۔ تین ہزار سال قبل افریقہ کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے لوگ کینیا میں آباد ہونے شروع ہوئے تھے۔ یہی افراد موجودہ کینیائی باشندوں کے آباء واجداد تھے۔ یہ لوگ شکار کرتے، مویشی پالتے اور کاشتکاری میں مصروف رہتے۔

جہاں تک بحری آمد و رفت کا تعلق ہے تو کینیا کا محل وقوع بہت آئیڈیل ہے۔ زمانہ قدیم سے اس کے ساحل پر یونانیوں، رومیوں اور عربوں کے جہاز لنگر انداز ہوتے آئے ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال قبل عرب تاجر کینیا کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوئے تھے۔ ۷۰۰ء میں کینیا کے ساحلوں پر عربوں کے مستقل شہر آباد ہو چکے تھے۔ یہ عرب تجارت پیشہ تھے اور کینیا کے اندرونی علاقوں کے عوام

سے ان کے تجارتی تعلقات تھے۔

۱۴۹۸ء میں پرتگالی طالع آزما (adventurer) واسکوڈاگاما کینیا پہنچا۔ دو سال بعد پرتگالیوں نے عربوں کو کینیا کے ساحلی علاقوں سے بے دخل کر دیا۔ اسکے سو سال بعد ۱۶۰۰ء میں عربوں نے پرتگالیوں کو شکست دے کر ساحلی علاقوں کو پھر سے اپنے قبضے میں کر لیا۔ تاہم عربوں اور پرتگالیوں نے کینیا کے اندرونی علاقوں کے عوام اور ان کے معاشرے کو بہت کم متاثر کیا۔

۱۸۸۷ء میں ایک برطانوی کمپنی نے زنجبار کے سلطان سے کینیا کے ساحلی علاقوں میں تجارت کرنے کے حقوق حاصل کیے۔ ۱۸۸۸ء میں برطانوی حکومت نے اس کمپنی کو تمام مشرقی افریقہ میں تجارت کرنے کی اجازت عطا کی۔ ۱۸۹۵ء میں برطانوی حکومت نے کینیا کے ساحلی علاقوں کو براہ راست اپنے قبضے میں لے لیا اور پھر تمام کینیا پر اپنا اقتدار جمانے کی کوششیں شروع کیں۔ برطانوی حکمراں اپنی سازش میں کامیاب رہے اور کینیا، برٹش ایسٹ افریقہ کے نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔ برطانوی حکومت نے برطانوی باشندوں اور دوسری سفید فام اقوام کو کینیا میں سکونت اختیار کرنے کی ترغیب دینی شروع کی۔ نتیجتاً کئی یورپی ممالک کے افراد کینیا میں آباد ہونے شروع ہوئے اور ملک کی معیشت پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ کینیا کے اصلی باشندے ان کے غلام ہو گئے اور معمولی اجرت پر یورپی افراد کی خدمت کرنے لگے۔ برطانیہ نے کینیا میں یورپی طرزِ تعلیم رائج کیا اور اس طرح سماجی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۰ء کے بعد سے کینیائی عوام نے برطانوی سامراج کی مخالفت شروع کی۔ اس تحریکِ آزادی میں وسطی کینیا کے کیکویو (Kikuyu) قبیلے کے افراد پیش پیش تھے۔ ۱۹۴۴ء میں کیکویو اور دوسرے قبائل نے مل کر ایک سیاسی جماعت۔ کینیا افریقین یونین بنائی اور اس طرح تحریکِ آزادی کو مہمیز لگی۔ اس پارٹی کے قائد جومو کینیٹا (Jomo Kenyatta) تھے۔

پانچویں دہائی کے اواخر میں کینیا افریقین پارٹی کے چند سرگرم اراکین نے حصولِ آزادی کی خاطر ایک خفیہ تنظیم بنائی جسے برطانوی حکمران ماؤماؤ (Mau Mau) کہا کرتے تھے۔ اس تنظیم نے کینیا کے تمام باشندوں کو متحد کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی حکمرانوں نے اس تنظیم کے خلاف ۱۹۵۲ء میں فوجی کارروائی شروع کی۔ سینکڑوں حریت پسند افریقی برطانوی فوج کی گولیوں کا شکار ہوئے، اور ہزاروں جیل میں بند کیے گئے۔ لیکن کینیا کے حریت پسندوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ وہ مسلسل برطانوی سامراج کو زک پہنچاتے رہے۔ یہ حریت پسند اپنی خفیہ مجالس میں

جو رجز گاتے تھے اس کی شروعات میں ایک نعرہ بلند ہوتا تھا۔Africa, Come back۔فیض نے اسی نعرے کو اپنی نظم کا عنوان مقرر کیا ہے۔

۱۹۵۳ء میں کینیٹا کو گرفتار کیا گیا لیکن ۱۹۵۶ء تک ان کی تنظیم کے اراکین نے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔اس جدو جہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھٹی دہائی کے اختتام تک کینیا کے تمام عوام جدو جہد آزادی میں شریک ہو گئے۔مجبوراً برطانوی سامراجیوں کو حریت پسندوں کے مطالبات قبول کرنے پڑے۔ فروری ۱۹۶۱ء میں انتخابات ہوئے اور کینیٹا کی پارٹی۔کینیا افریقن نیشنل یونین۔کو ان انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔لیکن کینیٹا ابھی تک جیل میں تھے۔اس لئے ان کی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر انھیں رہا نہیں کیا جاتا تو وہ حکومت نہیں بنائے گی۔بالآخر اگست ۱۹۶۱ء میں انہیں رہا کیا گیا۔

کینیا کو برطانوی سامراج سے مکمل آزادی ۱۲ر اگست ۱۹۶۳ء کو ملی۔ملک میں ایک نیا آئین تدوین ہوا جس کی رو سے کینیا میں آئینی بادشاہت قائم ہوئی۔کینیا افریقن نیشنل یونین برسرِ اقتدار آئی اور کینیٹا ملک کے صدر منتخب ہوئے۔

تلمیح ۳۳: اگست ۵۵ء

(نظم ص ۹۸)

قیام پاکستان کی آٹھویں سالگرہ۔برصغیر کی برطانوی سامراج سے نجات اور قیام پاکستان کی تفصیل کے لئے دیکھئے تلمیح ۲،۱

دستِ تہہِ سنگ

تلمیح ۳۴: دستِ تہِ سنگ

فیض کے چوتھے شعری مجموعے کا نام غالب کے شعر سے مستعار ہے جسے فیض نے اسی مجموعے میں شامل اپنی نظم "دستِ تہِ سنگ آمدہ" (ص ص ۲۲ تا ۲۴) کے اخیر میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کسی سے عہد و پیمان باندھتے وقت دو افراد ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں اور اس صورت میں ایک فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے ہاتھ کے نیچے آتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ اگر کسی فرد کا ہاتھ پتھر کے نیچے آ جائے اور وہ اسے پیمانِ وفا باندھنے کی رسم کہنے پر مصر ہو تو اسے صرف اس شخص کی مجبوری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح شعر کی تشریح یہ ہوئی کہ اگر کوئی شخص مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھرے رہنے کے باوجود کسی کے عشق میں گرفتار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس محبت کی مثال ایسی ہے جیسے دستِ تہِ سنگ آمدہ کو پیمانِ وفا ٹھہرایا جائے۔ غالب کے حالات کے لئے دیکھئے تلمیح ۱

تلمیح ۳۵: پیکنگ

(نظم "پیکنگ" ص ۲۶)

پیکنگ (موجودہ نام بیجنگ) کمیونسٹ چین کا دارالحکومت ہے اور شنگھائی کے بعد چین کا دوسرا بڑا شہر۔ ایک اندازے کے مطابق اس شہر کی موجودہ آبادی ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مختلف ادوار میں اس شہر کے مختلف نام تھے جن میں پیکنگ خاصا مشہور رہا۔ جب فیض نے اس شہر کی سیاحت کی تھی تو اس کا سرکاری نام بیجنگ ہو چکا تھا لیکن فیض نے اس کے سابقہ مشہور نام پر اپنی نظم کا عنوان مقرر کیا۔

سات مصرعوں کی اس مختصر نظم میں فیض نے چین کی راجدھانی کی مدح سرائی کی ہے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد چین میں جو ٹیکنالوجیکل، زرعی، معاشی اور فوجی ترقی ہوئی اسکے پیش نظر نظم میں شہر پیکنگ فخریہ انداز میں گویا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ کثیر الآباد ملک کے عوام اس کے دست و بازو ہیں اور اس قوت نے اسے اندازِ خدائی سے نوازا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے ع

تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح پیکنگ (بیجنگ) شہر کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں اس کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی تھی۔ بعد ازاں یہ سلطنت یِن (Yen) کا دارالحکومت رہا۔ یہ سلطنت چار سو سال قبل مسیح سے دو سو سال قبل مسیح تک قائم رہی۔ شی ہونگ تی (Shih Huang Ti) جسے چین کا پہلا ''شہنشاہ'' کہا جاتا ہے، نے سلطنتِ چن (Chin) کی بنیاد رکھی تھی اور چین کے جغرافیائی اتحاد کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس نے سلطنت یِن کو زیرِ نگیں کیا اور شہر پیکنگ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی شہنشاہ نے چین کے دفاع کے لئے دیوارِ چین کی تعمیر کا کام مکمل کیا تھا۔ اس کے بعد منچوریا کے ختان قبائل نے چین پر قبضہ کر کے ۹۰۵ء میں لیاؤ (Liao) سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس سلطنت کے فرمانرواؤں نے پیکنگ کا نام ینجنگ (Yenjing) رکھا اور اسے اپنی حکومت کا دوسرا دارالحکومت قرار دیا۔

۱۲۰۰ء میں منگولوں نے چین کو فتح کر کے سلطنت یوآن (Yuan) قائم کی اور منگولوں کے سردار قبلائی خان نے اس شہر کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنا کر اس کی از سرِ نو تعمیر کا کام شروع کیا۔ قبلائی خان کے زیر سرپرستی پھر ایک مرتبہ اس شہر کو اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت حاصل ہوئی اور اس کا شمار دنیا کے عظیم الشان شہروں میں ہونے لگا۔ قبلائی خان نے اس شہر کا نام خان بلیگ (Khanbalig) یعنی ''خانِ عظیم کا شہر'' رکھا تھا۔ قبلائی خان کے عہد میں اطالوی سیاح مارکو پولو نے ۱۲۷۵ء میں اس شہر کو دیکھنے کے بعد اپنے سفرنامے میں اس کی بے انتہا تعریف کی تھی۔ اس کے بعد پاپائے اعظم نے اپنے ایک نمائندے جیوونی دے مونتے کوروینا (Giovani de Monte Corvina) کو اس شہر میں بھیجا تھا۔ قبلائی خان نے بڑی عزت سے اس کا استقبال کیا اور ۱۳۰۷ء میں اسے خان بلیگ کا آرچ بشپ (Archbishop) مقرر کیا۔

۱۳۶۸ء چین پر سلطنت مِنگ کا قبضہ ہوا اور اس کے حکمرانوں نے شہر نانجنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا لیکن ۱۴۰۰ء میں انہوں نے پیکنگ کو راجدھانی بنا کر پہلے اس کا نام بیپنگ (بمعنی شمالی دارالامن) اور بعد میں بیجنگ (شمالی دارالحکومت) رکھا۔

سلطنتِ مِنگ کے بعد ۱۶۴۴ء میں چین میں منچو سلطنت قائم ہوئی اور اس سلطنت کے فرمانرواؤں نے اس شہر میں کئی محلات اور منادر تعمیر کروائے۔

۱۸۶۰ء میں فرانس اور برطانیہ کی حکومت نے چینی حکومت کو اس بات پر مجبور کیا کہ ان کے سفیروں کو بیجنگ میں قیام پذیر ہونے کی اجازت دی جائے۔ ملک پر بیرونی طاقتوں کے بڑھتے

ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے چینی عوام مضطرب تھے۔ ۱۹۰۰ء میں کچھ محب الوطن چینیوں نے (جنھیں مکے باز 'Boxer' کہا جاتا تھا) چین سے غیر ملکی افراد کو نکال باہر کرنے کی تحریک شروع کی۔ اس گروہ کے اراکین نے بیجنگ میں ایک جرمن سفیر کا قتل کر دیا اور اس کے بعد شمالی چین میں کئی چین نژاد عیسائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے ردعمل میں آٹھ ممالک بشمول جرمنی، ہندوستان، جاپان، روس اور امریکہ کی افواج نے بیجنگ پر حملہ کیا اور شہر کو تقریباً تباہ و برباد کر دیا۔ منچو سلطنت کا اختتام ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ پھر چین میں عوامی ریاست کا قیام عمل میں آیا جس کا دارالحکومت پیکنگ ہی تھا لیکن شہر پر در حقیقت مختلف جنگجو سرداروں کی حکمرانی تھی۔

۱۹۲۸ء میں چینی قومی پارٹی نے جنگجو سرداروں کا خاتمہ کر کے شہر پر اقتدار حاصل کیا۔ اس پارٹی کے قائد چیانگ کائی شیک (Chiang Kai Shek) نے نانجنگ کو اپنی حکومت کی راجدھانی بنایا اور بیجنگ کا نام بدل کر بی پنگ (Beiping) رکھا۔ ۱۹۳۷ء میں جاپانیوں نے چینیوں کو شکست دے کر اس شہر پر اپنا قبضہ جمایا۔ چینی قومی پارٹی نے ۱۹۴۵ء میں اسے دوبارہ فتح کیا۔ جب ۱۹۴۹ء میں چین میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو یہ شہر بھی چینی کمیونسٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو گیٹ آف ہیونلی پیس (Gate of Heavenly Peace) پر عوام سے خطاب کرتے ہوئے چینی انقلاب کے قائد ماؤزے تنگ (Mao Zedong) نے عوامی مملکتِ چین کے قیام کا اعلان کیا۔ کمیونسٹوں نے پھر ایک بار اس شہر کا نام بیجنگ رکھ کر اسے کمیونسٹ چین کا دارالحکومت قرار دیا۔

تلمیح ۳۶: کن فیکون

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزہ 'کن فیکون'

(نظم "پیکنگ" کا دوسرا اور آخری بند، ص ۲۶)

اللہ تعالیٰ ہر چیز کی تخلیق و تخریب کرنے پر قادرِ مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا اظہار قرآنِ مجید میں 'کن فیکون' کے الفاظ میں ہوا ہے۔ یہ الفاظ سورہ یٰسین کی ماقبل آخری (اکیاسویں)

آیت میں آئے ہیں۔ سورہ یٰسین کا نام عربی حروفِ تہجی کے دو حروف ی اور س کا مرکب ہے اور یہی حروف اس سورۃ کی پہلی آیت بھی ہیں۔ عام طور پر یٰسین سے مراد ''اے انسان'' لی جاتی ہے اہل اسلام اس سورۃ کی خصوصی تعظیم کرتے ہیں اور آلام و آزار، دورانِ روزہ اور قرب المُوت کی صورتوں میں خاص طور سے اس کا ورد کیا جاتا ہے۔ سورۃ کی اکیاسویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ جس چیز کے متعلق جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

تلمیح ۳۷: سنکیانگ ۔

(نظم ''سنکیانگ'' ص ۲۷)

فیض نے چین کی سیاحت کے بعد اس ملک کے سفرنامے بطور دو مختصر نظمیں کہی تھیں۔ پہلی نظم ''پیکنگ''، جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے اور دوسری نظم چین کے ایک صوبے سنکیانگ کے تعلق ہے۔

موجودہ عوامی جمہوریہ چین میں سنکیانگ ایک 'خود مختار' صوبہ ہے جو ملک کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کا حدود اربعہ چھ لاکھ پینتیس ہزار آٹھ سو تیس (۶,۳۵,۸۳۰) مربع میل اور آبادی تقریباً ایک کروڑ ہے۔ اس کا دار الحکومت اُروچی ہے۔ کمیونسٹ چین میں آزاد اور خود مختار صوبہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی صوبے کے عوام مذہبی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے اکثریتی عوام سے مختلف ہوں تو اس صوبے کے ساتھ autonomous (خود مختار) کا سابقہ جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس طرح کا صوبہ سیاسی اعتبار سے خود مختار و آزاد ریاست کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنکیانگ کی اسی (۸۰) فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور ثقافتی نقطہ نظر سے اس کے عوام پر ترکی تہذیب کا بہت گہرا اثر ہے۔

سنکیانگ سے متعلق فیض کی نظم میں صرف دو باتوں کا تذکرہ ہے۔ ایک تو یہ کہ اب خونریزی، دہشت گردی، تشدد، آگ اور خون کے نظارے اور خانہ جنگی وغیرہ کی باتیں قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ دوسری بات نظم کے آخری دو مصرعوں میں کہی گئی ہے۔

ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت

مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

یعنی فیض امن و استحکام کی موجودہ فضا سے مطمئن ہیں اور یہی اطمینان انھیں جشنِ عیش و

طرب آراستہ کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یوں تو پورے چین اور خاص طور پر سنکیانگ کی تاریخ مختلف جنگوں اور خانہ جنگیوں سے عبارت رہی ہے۔ اسی لئے فیض کی نظم کے پہلے نو (۹) مصرعے اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد حالات پرامن ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے اشتمالی عقائد پر ایقان رکھنے والے ایک شاعر کے لئے یہ بات قابلِ مسرّت ہے۔

چین تہذیبی اعتبار سے دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے تاہم اس کے حدودِ اربعہ مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ بحیثیت مملکت چین کا تصور زمانہ قدیم میں موجودہ کمیونسٹ چین کے تصور سے مختلف تھا۔ تیسری اور چوتھی صدی قبل مسیح کے دوران اس ملک میں ایک طاقتور اور مستحکم سلطنت ہین (Han) وجود میں آئی جس کے فرمانرواؤں نے تہذیبی اتحاد کو قائم کرنے کی غرض سے چینی (Chinese) لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔ تاریخی شواہد اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ چینی تہذیب کی نشوونما کسی ایک خاص مرکز سے یا ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے عوام میں نہیں ہوئی۔ چینی تہذیب آہستہ آہستہ مختلف مراکز سے اور مختلف النسل عوام کے باہمی اختلاط سے وجود میں آئی۔ پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں چینی ہونے کا مطلب ثقافتی تشخص تھا نہ کہ قومی یا نسلی۔

سلطنتِ ہین کے قیام کے بعد چین کی سرحدوں میں توسیع ہوتی گئی اور بہت سے ایسے علاقے جو ثقافتی اور نسلی اعتبار سے اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے تھے مختلف ادوار میں مملکتِ چین میں شامل کر لئے گئے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران منچو فرمانرواؤں کی فتوحات کے باعث چین کی سلطنت کے حدودِ اربعہ بہت وسیع ہو گئے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں کئی غیر چینی آبادی والے علاقے مثلاً تبت، منگولیا، منچوریا اور سنکیانگ چینی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔ ۱۸۸۴ء میں سنکیانگ کو چین کا ایک صوبہ قرار دیا گیا تاہم مقامی باشندے چونکہ غیر چینی تھے اور ان کی بھاری اکثریت مذہباً مسلمان تھی اس لئے چینی حکمرانوں کے خلاف جہاد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ ان وجوہات کی بناء پر عرصہ دراز تک اس صوبے میں خانہ جنگی کا ماحول بنا رہا۔

روس کی جانب سے بھی سنکیانگ میں مداخلت کا سلسلہ عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سنکیانگ کی معیشت اور تجارت پر روسیوں کا غلبہ تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جب سنکیانگ کو ایک چینی صوبے کی حیثیت دی گئی تو مقامی باشندوں کے ملّی اور علاقائی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے چینی حکمرانوں نے صوبے میں نظم و نسق قائم رکھنے کی ذمہ داری مقامی قائدین کو

سونپ دی۔ اس کے باوجود سنکیانگ کے مسلمان باشندے چینی سامراج کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ خانہ جنگی اور تشدد کا یہ ماحول ۱۹۴۹ء میں انقلابِ چین کے ساتھ ہی ختم ہوا جب کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار آئی اور پورے چین بشمول سنکیانگ میں ایک نئی طرزِ حکومت اور ایک نئی طرزِ زندگی کی شروعات ہوئی۔

فیض نے کمیونسٹ چین کے اسی صوبے سنکیانگ کی سیاحت کے بعد جب یہ نظم لکھی تو ان کے ذہن میں سنکیانگ کی تاریخ کا خونریز باب کھلا تھا اور نظم کے پہلے نو (۹) مصرعے اس کے شاہد ہیں۔ نظم کے آخری دو مصرعوں میں وہ کمیونسٹ حکومت کے قائم کردہ نظام سے مطمئن ہو کر دعوتِ جشن دیتے ہیں۔

تلمیح ۳۹ : بسم اللہ ۔

(نظم ''شورشِ زنجیر بسم اللہ''، ص ۴۲)

بسم اللہ کے لغوی معنی بنامِ اللہ ہیں۔ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو اہلِ اسلام کسی کام کے شروع کرنے سے قبل ادا کرتے ہیں۔ بسم اللہ کی دو صورتیں ہیں۔

۱. بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت رحم دل اور درگزر کرنے والا ہے۔ عام طور سے اہلِ اسلام یہ کلمہ کھانا شروع کرنے سے قبل، نئے کپڑے زیب تن کرنے سے پہلے، کسی کام کی ابتداء کرتے وقت یا کسی کتاب کے آغاز میں پڑھتے یا لکھتے ہیں۔ قرآن مجید کے ہر سورہ کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے سوائے قرآن پاک کی سورۃ ۹ ویں کے جسے سورۃ التوبہ یا سورۃ البرأۃ کہا جاتا ہے۔

۲. بسم اللہ اللہ اکبر، یعنی بنامِ اللہ، اللہ جو عظیم ترین ہے۔ بسم اللہ کی اس دوسری صورت کا استعمال جانوروں کو ذبح کرتے وقت یا آغازِ جنگ کے موقعہ پر ہوتا ہے۔ ان مواقع پر اللہ تعالیٰ کی رحم دلی کی صفات کو ادا نہیں کیا جاتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اس کلمے کی جڑیں درحقیقت یہودی عقائد میں پیوست ہیں۔ اہل قریش کو اس کا علم طائف کے ایک شاعر اُمیہ کے ذریعہ ہوا تھا۔ اُمیہ حضرت محمدؐ، رسول اللہ کا معاصر تھا گو عمر میں تھوڑا بڑا تھا۔ وہ تجارت کے سلسلے میں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک کی سیاحت کر چکا تھا اور اسی سبب وہ یہودی اور عیسائی صحائف کے تعلق سے باخبر تھا۔ (کتاب الاغانی ۱۶، بحوالہ روڈوِل

Rodwell، ڈکشنری آف اسلام از ٹامس پیٹرک ہیوز، کوسمو پبلی کیشنز، نئی دہلی، چوتھا ایڈیشن، ۱۹۸۶ء ص ۴۳)

تلمیح ۴۰: عیسیٰ و مریم ؎

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
تیرا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
(غزل کا مطلع، ص ۴۶)

عیسیٰ اور مریم کے لئے دیکھئے تلمیح ۲، ۱

تلمیح ۴۱: غالبؔ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
(نظم ''ختم ہوئی بارش سنگ'' کے اخیر میں تضمین شعرِ غالبؔ، ص ۵۶)

غالبؔ کے مندرجہ بالا شعر کا شمار اردو کے بہترین شعروں میں ہوتا ہے۔ اس میں جدّتِ بیانی، معنوی گہرائی، اسلوب کی ندرت اور بے ساختگی، سب کچھ شامل ہے۔ لفظ مکرّر کے استعمال نے فضابندی بھی کردی ہے یعنی پہلی مرتبہ ساقی بآوازِ بلند کہتا ہے یا ایک طرح کا چیلنج دیتا ہے ؏

کون ہوتا ہے حریفِ مئے فرد افگنِ عشق

پھر جیسے ایک سناٹا۔ کہیں سے نہ تو کوئی آواز ہی آتی ہے اور نہ ساقی کے چیلنج کو کوئی دوسرا شخص قبول کر کے سامنے آتا ہے۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر ساقی اسی مصرعے کو دہرائے جاتا ہے جس کا بیان مصرعۂ ثانی میں ہے۔

غالبؔ کے حالات کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱

تلمیح ۴۲: اہرمن ؎

ایک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں
اک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف
(نظم ''شہریاراں'' کا پانچواں شعر، ص ۶۵)

زرتشت کی تعلیمات کے مطابق خیر وشر کی قوتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ خیر کی طاقت کا مظہر یزادں ہے (لفظ دراصل ایزداں ہے جو جمع ہے لفظ ایزد کی، لیکن اردو میں یہ لفظ یزداں بطور واحد استعمال ہوتا ہے۔ اہرمن شر کی علامت ہے جس کے لغوی معنیٰ ''خردِ خبیث'' کے ہیں یعنی وہ عقل جو راہ سے بھٹک گئی ہو۔

اسلامی عقائد میں شیطان بھی کچھ ایسی ہی عقل وفراست کی علامت ہے جو غلط راستے پر گامزن ہے۔

تلمیح ۴۳: غالبؔ ؎

رنگ ہے دل کا میرے ''خونِ جگر ہونے تک''

(نظم ''رنگ ہے دل کا مرے'' کے چوتھے مصرعے میں غالبؔ
کے مصرعے کا ایک جز تضمین ہوا ہے۔ ص ۷۱۔)

غالبؔ کا شعر ہے ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

خونِ جگر ہونے کے معنی ہوئے موت، فنا، مرجانا۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ عاشقی ایک صبر طلب کام ہے یعنی عشق میں کامیابی یا سرخروئی کے لئے ایک عرصے تک صبر وتحمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ان کے دل کی تمنا انھیں بے چین و بے قرار رکھتی ہے اور یہ صورتحال صبر وتحمل کے منافی ہے۔ ان دو متضاد صورتوں میں دل کی تسکین کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ یعنی جب تک زندہ ہوں تب تک دل کو کیسے بہلاؤں۔

غالبؔ کے حالات کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱

تلمیح ۴۴: خواجہ میر دردؔ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

(غزل کے اخیر میں خواجہ میر دردؔ کا شعر تضمین ہوا ہے، ص ۷۸)

صوفی اور شیخ اردو اور فارسی روایات میں دو مختلف بلکہ متضاد کردار ہیں جو مختلف صفات کے

حامل ہیں۔ صوفی اپنے باطن کی طہارت اور اپنی اَنا کو فنا کر کے ذاتِ حقیقی کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ شیخ سختی سے شریعت سے پابندی کرتا ہے، اور ہر راسخ العقیدہ مسلمان سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسلام کے تمام فرائض پابندی سے ادا کرے۔ دوسرے لفظوں میں شیخ باطن کی طہارت پر نہیں بلکہ فرائض کی ظاہری ادائیگی پر زور دیتا ہے۔

خواجہ میر درد خود صوفی تھے اور انہوں نے مندرجہ بالا شعر میں شیخ کو مخاطب کر کے کہا کہ 'اے شیخ ہماری رندی و سرمستی سے کسی مغالطے کا شکار نہ ہو کیونکہ ہم تو وہ پاکدامن ہیں کہ ہمارا مقابلہ فرشتوں سے کیا جاسکتا ہے۔'

خواجہ میر درد کی ولادت ۱۷۲۰ء میں دہلی میں ہوئی اور انہوں نے اسی شہر میں ۷ رجنوری ۱۷۸۵ء کو انتقال کیا۔ اپنے نام کے تعلق سے انہوں نے خود لکھا ہے کہ ان کے نانا میر سید حسینی قادری نے رکھا تھا اور اپنے تخلص کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے والد کا تخلص عندلیب تھا جو انہوں نے پیر صحبت شاہ سعد اللہ گلشن کے تخلص کی مناسبت سے رکھا تھا۔ خواجہ میر درد نے عندلیب کی مناسبت سے اپنا تخلص درد رکھا۔

درد نجیب الطرفین حسینی سید تھے جن کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت بہاء الدین نقش بند سے اور والدہ کی طرف سے سید عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب تھا۔

درد فارسی اور عربی کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور علمِ تصوف پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ موسیقی سے درد کا لگاؤ اپنے والد کے پیر صحبت شاہ گلشن کی طرح پیدائشی تھا۔ نقشبندیہ سلسلہ میں سماع منع ہے لیکن باوجودیکہ درد کا تعلق اسی سلسلے سے تھا وہ ذوقِ موسیقی کو ترک نہ کر سکے۔

ادب اور شاعری کی طرف درد کا رجحان ابتدائے عمر سے تھا۔ جب وہ صرف پندرہ (۱۵) سال کے تھے تو انھوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار الصلوٰۃ'' فارسی زبان میں لکھی۔ ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ اور عالی مرتبہ والد کے بیٹے تھے۔ انھوں نے ایک ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پائی جہاں علم و فضل بھی تھا اور حقیقت و سلوک کے مشاہدات بھی۔ ان کے مزاج میں تہذیبی رچاؤ، روایت پسندی اور نکھرا ستھرا پن تھا انھیں صفات کا عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ درد نے ہجو یا قصیدے سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا حالانکہ سودا نے ''در مدح سیف الدولہ احمد علی خان بہادر'' جو قصیدہ لکھا اس میں درد پر بھی چوٹیں کی تھیں۔ انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

درد کے مزاج میں استقلال، ہمواری اور قناعت پسندی تھی۔ انسانی رشتوں کا احترام ان کے لئے مذہب کا درجہ رکھتا تھا اور دل آزاری کو وہ گناہ سمجھتے تھے۔ ان کا کلام صاف ستھرا، سادہ، شگفتہ اور مترنّم ہے۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد بارہ ہے جن میں دیوانِ اردو کے علاوہ بقیہ سب تصانیف فارسی میں ہیں۔

سرِ وادیٔ سینا

تلمیح ۴۵ : سرِ وادیٔ سینا ؎

(فیض کے پانچویں شعری مجموعے کا نام)

کوہِ سینا یعنی کوہِ طور۔ اس پہاڑ کے قریب حضرت موسیٰ کلیم اللہ حق تعالیٰ سے متکلم ہوئے تھے۔ لفظ سینا بمعنی تجلیٔ الٰہی استعمال ہوتا ہے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ بحرِ قلزم کے دو شاخے کے درمیان اور مصر کے قریب واقع ہے۔ یہی وادی، وادیٔ ایمن یا وادیٔ سینا کہلاتی ہے۔

فیض نے ۱۹۶۷ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ کے خاتمے پر اپنی نظم "سرِ وادیٔ سینا" کہی تھی جو اس مجموعے میں شامل ہے اور مجموعے کا نام بھی اسی نظم سے مستعار ہے۔

تلمیح ۴۶ : مریم سلگانیک ؎

("سرِ وادیٔ سینا" کا انتساب، ص ۳)

فیض نے کئی مرتبہ روس کے دورے کیے۔ روس میں مریم سلگانیک اکثر ان کی ترجمان رہیں اور اسی تعلقِ خاطر سے فیض نے یہ مجموعہ اس خاتون کے نام کیا۔

تلمیح ۴۷ : میر تقی میرؔ ؎

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

(ص ۵ پر فیض نے میر کا مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے)

شعر سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے اس لئے تشریح طلب بھی نہیں۔ منصور کے نام کی وجہ سے تلمیحی شعر ہے۔ منصور حلاج کے حالات کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۶۔

اردو اور فارسی شاعری میں قیس و منصور کی روایت عام بات ہے یعنی عشق اور معرفت کی روایت۔ صوفی کو جب ذاتِ حقیقی کا عرفان ہو جاتا ہے تو وہ فنا کی منزل پر پہنچتا ہے۔ وحدت الوجود کے فلسفے کا لب لباب یہی ہے کہ ذاتِ حقیقی کا جلوہ اس کائنات کی ہر شئے میں نظر آتا ہے لیکن اس کا نظارہ کرنے کیلئے صوفی کی آنکھ چاہئے۔ اس آنکھ (نظر) کو پیدا کرنے کے لئے تصوف میں کئی مدارج سے گذرنا ہوتا ہے۔ منصور حلاج نے یہ تمام مدارج طے کر لئے تھے اور جب انھیں ذاتِ حقیقی کا عرفان ہوا تو وہ چلا اٹھے، "انا الحق" فقہا اور علماء کا وہ طبقہ جو اسلام کے فرائض اور احکامات کی

ظاہری پابندی کو عین روح مذہب سمجھتا تھا منصور حلاج کے رویے پر سخت برہم ہوا اور بالآخر انھیں دار پر کھینچا گیا۔

میر کے شعر میں اس بات کا ذکر ہے کہ اہلِ باطن اور اہلِ معرفت کے حصہ میں ہمیشہ تختۂ دار ہی آتا ہے۔ تاہم شعر کی خوبی اس کے فنی اور جمالیاتی محاسن کی وجہ سے ہے۔ موسم نخل اور بار، یہ تینوں الفاظ اس بات کی ترجمانی کررہے ہیں کہ درخت ایک خاص موسم میں ثمر آور ہوتا ہے۔ دار اور منصور کے ذکر سے یہ خاص موسم، وقتِ شہادت بن جاتا ہے یعنی اہلِ معرفت جب اپنی انتہا کو پہنچیں گے تو موسمِ شہادت آئے گا اور نخلِ دار منصور کی طرح کے لوگوں ہی سے ثمر آور ہوگا۔

محمد تقی میر ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ دس برس کے تھے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سوتیلے بھائیوں نے انھیں اتنی اذیتیں دیں کہ مجبوراً انھیں آگرہ چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ ان دنوں خود شہرِ دہلی کی حالت بے انتہا ابتر تھی۔ ایسے پر آشوب ماحول میں میر نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے گھر میں پناہ لی۔ آرزو کا رویہ بھی بڑا ذلت آمیز تھا۔ میر دہلی کے مختلف امراء کی مصاحبت میں رہنے لگے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد دہلی مکمل طور پر تباہ ہوگئی اور میر کے لئے گذر اوقات کے راستے بالکل ہی بند ہوگئے۔ ان حالات کے پیشِ نظر وہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے پاس چلے گئے۔ نواب نے دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کردیا تھا۔

میر انتہائی غیور، تنک مزاج، وضعدار اور خود پسند انسان تھے۔ طبعاً غمگین، ملول اور قناعت پسند تھے۔ کردار کی ان خصوصیات کے گہرے اثرات میر کے کلام میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کافی لمبی عمر پائی اس لئے ان کی تصانیف بھی بہت ہیں۔ میر نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن ان کی عظمت اور شہرت کا انحصار ان کی غزلیات پر ہے۔ اپنے زمانے کے بحرانی حالات اور ذاتی مصائب نے ان کے کلام کو سراپا درد و گداز بنادیا۔ ان کی غزلیں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی اور شوخی کی کیفیات سے عبارت ہیں۔

میر نے اردو غزل کو ایک عظیم مرتبہ عطا کیا اور وہ آج تک اس صنف کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور طرزِ بیان میں اندازِ تخاطب ملتا ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کو نہ صرف ان کے ہم عصروں بلکہ بعد کے ناقدین نے بھی تسلیم کیا۔

تلمیح ۴۸ : صدر ایوب

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

(قطعہ، ص ۲۹)

انا الحق کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۱۶، منصور حلاج۔ اس قطعہ کے متعلق فیضؔ نے حاشیہ میں ایک وضاحت کی ہے کہ " گلاب کا پھول سابق صدر ایوب خاں کا انتخابی نشان تھا۔" قطعہ کے تیسرے مصرعے میں پھولوں کا ذکر ہے جو اشارہ کرتا ہے ایوب خان کے انتخابی نشان کی طرف۔ اس سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیضؔ نے اس قطعہ میں ایوب خاں کی سیاست اور اس کے نتیجے میں قائم کردہ نظام مملکت پر دبے لفظوں میں تنقید کی ہے۔ ایک ایسا نظامِ مملکت جس میں ایک طرف تو صاف گو اور بے قصور انسان قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے اور دوسری طرف شراب و کباب کی محفلیں آراستہ تھیں، ایک طرف عوام کی تمناؤں کا خون ہو رہا تھا تو دوسری طرف عیش وطرب کی داد وصول کی جارہی تھی، ایک طرف اربابِ اقتدار کے دامن پھولوں سے لدے تھے تو دوسری طرف عوام خون کے آنسو رو رہے تھے، ایک طرف جشن منایا جارہا تھا تو دوسری طرف صفِ ماتم بچھی تھی۔

فیضؔ نہ تو ایک انقلابی تھے اور نہ ہی سرگرم سیاسی رہنما۔ تاہم سیاست کے تعلق سے ان کا ایک نظریہ ضرور تھا جو صحت مند انسانی قدروں، جمہوریت، مساوات، رواداری اور فکر وعمل کی آزادی پر منحصر تھا۔ اس نظریے کی بازگشت ہمیں ان کی شاعری میں اکثر جگہ سنائی دے گی۔ اسی نظریے نے انھیں اپنے وطن اور اہل وطن سے محبت کرنا سکھایا۔ فیضؔ نے پاکستان کے ہر اہم سیاسی واقعہ پر اپنے ردعمل کا اظہار اپنی نظموں اور غزلوں میں کیا ہے لیکن گلا پھاڑ کر نہیں بلکہ ایک سنجیدہ، گمبھیر اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں۔ اپنی تخلیقات میں سیاسی موضوعات کو برتتے وقت بھی انھوں نے ڈکشن وہی رکھا ہے رومانی اور عشقیہ شاعری کا۔

پاکستان میں جمہوریت کی جڑیں ہمیشہ ہی کمزور رہی ہیں۔ قیام پاکستان سے لے کر آج

تک وہاں اصل اقتدار ہمیشہ ہی فوج کے اعلیٰ عہدے داروں، بیوروکریٹس اور مذہبی علماء کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ لیکن ان تینوں طبقات میں بھی فوجی افسران کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ عوامی نمائندوں کو فوجی افسران اس وقت تک برداشت کرتے ہیں جب تک وہ ان کے مفادات کا تحفظ کرتے رہیں۔ جیسے ہی عوامی نمائندوں کی پالیسیوں اور فوج کے مفادات میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جاتی ہے۔

۱۹۵۸ء میں بھی یہی ہوا۔ فوج کے کمانڈر ایوب خان نے عوامی حکومت کا تختہ الٹ کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ انہوں نے عوام کے تمام حقوق معطل کر دیئے۔ شہری حقوق، سیاسی حقوق اور آزادیٔ فکر و عمل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ظاہر ہے اس قسم کے آمرانہ نظامِ حکومت میں صرف مراعات یافتہ طبقے کے افراد ہی کو تمام آسائشیں میسّر تھیں اور عوام کی بڑی اکثریت افلاس، جہالت، گندگی اور ذلت کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ عوام مضطرب تھے اور بہت ممکن تھا کہ وہ اپنے حقوق کی بحالی کے لئے سڑکوں پر نکل آتے۔ جب ایوب خاں نے عوام کے صبر کا پیمانہ چھلکتا ہوا دیکھا تو براہ راست فوجی ڈکٹیٹر شپ کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ جمائے رکھنے کی پالیسی میں تبدیلی کی اور عیاری پر اتر آئے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے ''بنیادی جمہوریت'' کے گمراہ کن نظریے کے تحت انتخابات کا اعلان کیا اور خود صدرِ پاکستان کے عہدے کے لئے امیدوار بنے۔ اس انتخاب میں بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح ان کے مدمقابل تھیں۔ اس الیکشن میں ایوب خاں کا انتخابی نشان گلاب کا پھول تھا۔ الیکشن کیا تھا، ایک ڈھکوسلہ تھا، جمہوریت کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ اسی عیاری پر فیض نے اپنے قطعے میں طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

اس قطعہ کے بعد کی کچھ نظموں، غزلوں اور قطعات کا پس منظر بھی سراسر سیاسی ہے۔ ان تخلیقات میں براہ راست تلمیحات تو نہیں ہیں (سوائے نظم ''بلیک آوٹ'' کے جس میں 'یدِ بیضا' کا ذکر ہے جس کی تشریح آگے آئے گی) لیکن ان کا پس منظر بھی ایوب خان کے دورِ اقتدار اور ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ ہے۔ فیضؔ کی خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے کو تنگ نظری اور تعصّبات سے بچائے رکھا۔ اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود وہ تنگ نظر قومیت کے تصور کے حامی نہیں تھے جس کی اساس یا تو مذہب پر ہوتی ہے یا جغرافیائی حدود پر۔ اس کے برخلاف وہ ثقافت، تاریخی ورثہ اور زبان (بشمول ادبی روایات) کو قومیت کے نظریے کے اجزائے ترکیبی سمجھتے تھے۔ یہ ایک سائنٹفک اور مثبت رویّہ تھا۔ اسی لئے فیضؔ نے ہند۔ پاک جنگوں کے دوران نہ تو پاکستان کی فتح

کے لئے دعا کی اور نہ پاکستان کے "درست" موقف کے حق میں نعرے لگائے۔ اس مجموعے میں ۱۹۶۵ء کے دوران کی جو نظمیں اور قطعات شامل ہیں ان کا پس منظر تو یقیناً ہند۔ پاک جنگ ہی ہے لیکن ان میں فیض انسانی قدروں کی پامالی کے ذکر کے ساتھ بالآخران کی بحالی کے لئے دعا گو ہیں۔ یہ شعری نگارشات مندرجہ ذیل ہیں:

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

(قطعہ، ص ۳۰)

"یہاں سے شہر کو دیکھو" (نظم، ص ۳۱)
"غم نہ کر، غم نہ کر" (نظم، ص ۳۴)
"بلیک آؤٹ" (نظم، ص ۳۵)
"سپاہی کا مرثیہ" (نظم، ص ۳۸)

تلمیح ۴۹: یدِ بیضا ع

برق آئے مری جانب یدِ بیضا لے کر
(نظم "بلیک آؤٹ" کا دسواں مصرعہ، ص ۳۶)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جو معجزات عطا کئے تھے ان میں سے ایک یدِ بیضا بھی تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ کے حالات سرسری طور پر بیان کئے جائیں۔ حضرت موسیٰ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس عہد میں مصر کا فرمانروا فرعون ولید ابن مصعب تھا جو بے حد ظالم، جابر اور بدکار بادشاہ تھا۔ وہ بنی اسرائیل کو سخت تکلیفیں دیتا اور چاہتا تھا کہ تمام لوگ اسے خدا تسلیم کریں۔ بنی اسرائیل نے جب اس کی بات نہ مانی تو اس نے انھیں غلام بنالیا اور پتھر ڈھونے اور محلات کی تعمیر پر مامور کیا۔ ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ آگ کا ایک شعلہ ملکِ شام کی طرف سے لپکا اور اس نے قبطیوں (قطب حام ابن نوح کی نسل سے ایک شخص کا نام تھا اور قبطی لوگ جو مصر کے باشندے اور فرعون کی رعایا تھے، اسی کی اولاد میں سے تھے) کے تمام قلعے اور حویلیاں خاکستر کردی۔ معبروں نے

فرعون کو خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو قبطیوں کی سلطنت کا خاتمہ کردیگا۔ فرعون نے حکم صادر کیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو فوری قتل کر دیا جائے۔ پانچ برس تک اس حکم پر عمل ہوتا رہا۔ پھر یہ حکم دیا گیا کہ ایک سال کے دوران پیدا ہونے والے لڑکے قتل کردیئے جائیں اور دوسرے سال پیدا ہونے والے چھوڑ دیئے جائیں۔ جب حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارون کی ولادت ہوئی تو وہ معافی کا سال تھا لیکن خود حضرت موسیٰ اس سال میں تولد ہوئے جس کے دوران بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے تمام لڑکے قتل کئے جارہے تھے۔

جب حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ نے حکمِ الٰہی کے مطابق انھیں ایک صندوق میں بند کیا اور اس صندوق کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔ خدا کی قدرت سے وہ صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور لونڈیاں اسے اٹھا کر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے سامنے لے آئیں۔ حضرت آسیہ نے بچے کا نام موسیٰ تجویز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور آسیہ کے دل میں حضرت موسیٰ کے تعلق سے محبت کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح فرعون کے محل میں ان کی پرورش ہوئی۔

فرعون کے صلاح کاروں نے کئی مرتبہ یہ تنبیہ کی یہ وہی لڑکا ہے جو فرعون کی سلطنت کو نیست و نابود کردے گا۔ لیکن حضرت آسیہ نے، جو بنی اسرائیل سے تھیں فرعون کو حضرت موسیٰ کے قتل سے باز رکھا۔ رعایا حضرت موسیٰؑ کو فرعون کا بیٹا ہی سمجھتی تھی اور ان کی حیثیت شہزادے کی سی تھی۔ ایک دفعہ ایک قبطی شخص بنی اسرائیل کے ایک شخص پر سختی کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب یہ دیکھا تو پہلے قبطی کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس پر بھی وہ نہ مانا تو انہوں نے اسے ایک طمانچہ مارا اور قبطی اسی وقت فوت ہوگیا جب فرعون تک یہ خبر پہنچی تو اس نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت موسیٰؑ مصر چھوڑ کر شہر مدین کی طرف چلے گئے اور وہاں حضرت شعیبؑ سے ملاقات کی جو ان دنوں بہت ضعیف اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی صفورا حضرت موسیٰؑ کے نکاح میں دی اور مہر کے تعلق سے یہ طے پایا کہ حضرت موسیٰؑ آٹھ برس تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں اور اگر دس برس تک چرائیں تو یہ ان کا احسان ہوگا۔ حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو وہ لاٹھی بھی عنایت کی جو حضرت آدمؑ بہشت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

حضرت موسیٰؑ دس برس تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چراتے رہے اور معیاد ختم ہونے کے بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ جاڑے کا موسم تھا اور جب سردی کی شدت بہت بڑھ گئی تو انھیں آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت انھیں کوہ طور پر روشنی نظر آئی۔ حضرت موسیٰؑ اپنی لاٹھی

تھا سے روشنی کی طرف روانہ ہوئے۔ کوہ پر پہنچے تو انھیں نورِ الٰہی کا دیدار ہوا جسے وہ غلطی سے آگ سمجھ کر اس سے سوکھی لکڑیاں سلگانے کی کوشش کرنے لگے۔ نور کا شعلہ بلند ہوا اور حضرت موسیٰ حیران و پریشان ہو کر واپسی کے لئے مڑے۔ تب انھیں ایک آواز سنائی دی۔ ''اے موسیٰ! میں ہوں تیرا اور سب کا پروردگار۔ تو ایک پاک میدان میں ہے جس کا نام طوبیٰ ہے۔ اپنی جوتیاں اتار ڈال۔'' حضرت موسیٰ نے ارشادِ الٰہی کی تعمیل کی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت عطا کی اور فرمایا۔ ''میں نے تجھے پسند کیا۔'' پھر ان سے سوال کیا، ''اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' حضرت موسیٰ نے جواب دیا، ''میری لاٹھی ہے۔ اس پر میں تکیہ کرتا ہوں اور بکریوں کے واسطے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے اور بہت سے کام نکلتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ ''اسے پھینک دے۔'' جونہی حضرت موسیٰ نے لاٹھی کو زمین پر ڈالا وہ ایک خوفناک اژدہا بن گئی۔ حضرت موسیٰؑ ڈر گئے لیکن پھر آواز آئی، ''اسے پکڑ لے اور خوف نہ کر'' حضرت موسیٰؑ نے سنبھل کر اژدہے کو جیسے ہی پکڑا تو لاٹھی پھر ان کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرا معجزہ عنایت کیا اور فرمایا ''اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر باہر نکال۔'' حضرت موسیٰؑ نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جونہی باہر نکالا تو ان کے ہاتھ کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ تھی اور یہی معجزہ عربی میں یدِ بیضا کہلاتا ہے۔ ید معنی ہاتھ اور بیضا معنی آفتاب۔

یہودیوں کی مقدس کتاب عہد نامہ قدیم (تورات) میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر خصوصی طور پر دو کتابوں یعنی تورات کی دوسری کتاب سفر خروج (Exodus) اور پانچویں کتاب سفر استثناء (Denteronomy) میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ کی ولادت، فرعون کے محل میں ان کی پرورش، قبطی (مصری) شخص کو قتل کرنا، مصر سے ہجرت کر جانا، بکریاں چرانا وغیرہ واقعات قرآن مجید اور تورات میں تقریباً یکساں مذکور ہوئے ہیں البتہ قرآنِ مجید کی رو سے حضرت موسیٰ کی پرورش فرعون کی بیوی آسیہ نے کی تھی جبکہ تورات میں مذکور ہے کہ ان کو فرعون کی بیٹی نے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ حق تعالیٰ کے نور سے متکلم ہونے کے تعلق سے بھی قرآن مجید اور تورات کے بیانات میں مطابقت ہے۔

حق تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰؑ کو معجزے عطا کئے اور انھیں فرعون کو راہ راست پر لانے کا حکم دیا تو وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ساتھ لے کر فرعون کے پاس گئے۔ اسے دینِ حق قبول کرنے کی دعوت دی۔ معجزے دکھائے لیکن وہ ملعون نہ تو خود ہی راہِ راست پر آیا اور نہ بنی اسرائیل کو اپنے شکنجے سے آزاد کرنے پر راضی ہوا بلکہ بنی اسرائیل پر مزید ظلم ڈھانے شروع کئے۔ فرعون کے جبر اور قہر کی انتہا نہ رہی تو بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ سے شکایت کرنے لگے۔ ان کا ایمان متزلزل ہونے

لگا۔ جب بھی کوئی نیا قہر ان پر ٹوٹتا تو حضرت موسیٰ سے التجا کرتے کہ حق تعالیٰ سے دعا کریں اور انہیں مصیبت سے نجات دلائیں۔ جب بارگاہِ حق میں حضرت موسیٰ دعا کرتے اور مصیبت ٹل جاتی تو پھر کفر کی طرف مائل ہوتے۔ بالآخر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ہدایت کی کہ وہ ایک شب بنی اسرائیل کو ہمراہ لے کر مصر سے کوچ کر جائیں۔ انہوں نے تعمیل کی۔ جب فرعون تک خبر پہنچی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلا۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل جب سمندر کے قریب پہنچے تو فرعون اور ان کے سپاہی ان کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت موسیٰ نے اپنا عصا سطح سمندر پر مارا۔ یکایک سمندر کا پانی شق ہوا اور زمینی راستہ نکل آیا۔ راستے کے دونوں جانب جیسے آبی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بعافیت سمندر پار کرانے میں کامیاب ہوئے۔ فرعون ان کا تعاقب کرتا ہوا معہ لشکر بیچ راستے میں پہنچا تو خدا کی قدرت سے دونوں آبی دیواریں پھر ایک دوسرے سے مل گئیں اور فرعون اور اس کا لشکر ڈوب مرا۔

توراۃ میں اس واقعے کے ضمن میں بحیرۂ احمر کا ذکر آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل بحیرہ احمر کے کنارے پہنچے اور فرعون اور اس کا لشکر بھی ان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچا تو حضرت موسیٰ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور سمندر کا پانی دو حصوں میں منقسم ہوا۔ یہودی عقائد کی رو سے حضرت موسیٰ نہ صرف ایک جلیل القدر پیغمبر تھے بلکہ عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابوں جنہیں مجموعی طور پر کتب خمسہ (Pentatench) کہا جاتا ہے، کے مصنف بھی۔ اسرائیلیات میں ان کی اہمیت نہ صرف نبوت بلکہ یہودی قوانین کے مؤلف ہونے کی وجہ سے بھی ہے۔

تلمیح ۵۰ : عرب۔ اسرائیل تنازعہ

(نظم ''سرِ وادیٔ سینا'' ص ۵۳ و ۵۴)

ذیلی عنوان میں فیضؔ نے وضاحت کی ہے کہ یہ نظم انہوں نے ۱۹۶۷ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ کے بعد کہی تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ عرب۔ اسرائیل تنازعہ کی نوعیت اور اس خطے کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

عالمی تاریخ میں سرزمین فلسطین کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق دنیا کے تین عظیم مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام سے ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس علاقے میں امن وامان اور سلامتی کا دور دورہ رہنا چاہئے تھا لیکن بدقسمتی سے بعض تاریخی، مذہبی اور سیاسی وجوہات

کی بناء پر سرزمینِ فلسطین اکثر جنگ وتشدد کی لپیٹ میں رہی۔

عرب۔اسرائیل تنازعہ نتیجہ ہے یورپی ممالک کی ان غلط پالیسیوں کا جو پہلی جنگ عظیم کے بعد نافذ العمل کی گئیں۔ جنگ کے بعد فلسطین کو ''لیگ آف نیشنز'' (League of Nations) کے زیرنگرانی برطانیہ کے حوالے کیا گیا۔ برطانوی حکمرانوں نے اپنی سازشوں سے بالآخر فلسطین کے ٹکڑے کئے اور ایک یہودی مملکت اسرائیل کی تخلیق کی۔

زمانہ قدیم سے فلسطین میں سامی النسل لوگ آباد تھے۔سامی مذاہب کی روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، جو عربوں اور یہودیوں دونوں کے جدِ امجد ہیں، اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۰۰۰ ق۔م۔ میں حضرت داؤدؑ نے بنی اسرائیل کو منظم کر کے اپنی سلطنت قائم کی۔اس سلطنت کا عروج حضرت داؤدؑ کے فرزند حضرت سلیمانؑ کے دور میں ہوا جنہوں نے یروشلم کا پہلا عبادت خانہ تعمیر کروایا تھا۔حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد فلسطین میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

۷۲۰ ق۔م۔ کے آس پاس اسیرین نے بنی اسرائیل کی حکومت کو شکستِ فاش دی اور بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا۔ ۶۰۰ ق۔م۔ کے آس پاس بابل کے فرمانروا بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا اور ۵۶۷ ق۔م۔ کے آس پاس شہر یروشلم اور حضرت سلیمانؑ کے عبادت خانے کو تباہ و برباد کر دیا۔اس کے پچاس سال بعد جب فارس کے بادشاہ سائرس نے بابل فتح کیا تو یہودی پھر سے فلسطین لوٹ سکے اور ۵۱۵ ق۔م۔ کے آس پاس حضرت سلیمانؑ کا عبادت خانہ ازسرِنو تعمیر کیا گیا۔ ۳۳۲ ق۔م۔ میں فلسطین پر مقدونیوں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے یہودیوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے۔ ۱۷۰ ق۔م کے آس پاس یہودیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن ناکام رہے۔مقدونیوں نے حضرت سلیمانؑ کے عبادت خانے کو ایک بار پھر مسمار کر دیا۔مقدونیوں کی آمریت کے خاتمہ کے بعد کچھ عرصہ تک فلسطینیوں کو کسی حد تک آزادی اور خودمختاری میسّر ہوئی۔اس کا خاتمہ ۶۳ ق۔م میں ہوا جب روم کے شہنشاہ پومپی نے فلسطین فتح کیا۔ ۷۰ ق۔م۔ میں ٹائٹس نے یروشلم کو مکمل طور پر تباہ کر دیا اور حضرت سلیمانؑ کے عبادت خانے کی صرف مغربی دیوار اس تباہی سے محفوظ رہ سکی جو عرفِ عام میں 'دیوارِ گریہ' کہی جاتی ہے۔

اس سے قبل دوسری صدی عیسوی میں شہنشاہ مدرین نے یروشلم میں یہودیوں کے داخلے پر پابندی لگادی تھی جس کے بعد یہودی فلسطین سے ہجرت کر کے دنیا کے دوسرے ممالک میں آباد

ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں دوسری صدی عیسوی سے لے کر ۱۹۴۸ء میں قیامِ اسرائیل تک نہ تو فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت تھی نہ حکومت۔

۷۰۰ء میں جب روم کی سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو فلسطین بزنطینی سلطنت (مشرقی رومی سلطنت) کا حصہ تھا۔ عربوں نے فلسطین کو ۶۳۷ء میں فتح کیا اور حضرت سلیمانؑ کے مسمار شدہ عبادت خانے کی جگہ پر مسجد اقصیٰ اور گنبدِ سنگ (Dome of the rock) تعمیر کیے جنہیں حرم الشریف کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے مکہ اور مدینہ کے بعد یہ مقام سب سے زیادہ مقدس ہے۔

پھر صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جو ۱۰۹۹ء سے ۱۱۹۰ء تک جاری رہا۔ بالآخر صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو شکست فاش دی۔ فلسطین پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے دنیا بھر کے یہودیوں کو دعوت دی کہ وہ بلا خوف و خطر فلسطین میں آباد ہو سکتے ہیں۔

۱۵۱۷ء میں ترکوں نے فلسطین فتح کیا اور اس طرح یہ علاقہ خلافتِ عثمانیہ کا حصہ قرار پایا۔ یہ صورتحال پہلی جنگ عظیم تک برقرار رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۷ء کے اواخر میں برطانوی فوجوں نے فلسطین پر اپنا قبضہ جمالیا۔

اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سوائے صلیبی جنگوں کے دور کو چھوڑ کر فلسطین پر مسلمانوں (عربوں اور ترکوں) نے ایک ہزار تین سو سال حکومت کی جس کی ابتداء بزنطینی سلطنت کے خاتمہ سے ہوئی تھی۔ فلسطین کی آبادی سامی النسل عربوں پر مشتمل رہی جن میں مسلمانوں کی اکثریت کے علاوہ تھوڑے بہت عیسائی اور یہودی بھی شامل تھے۔ عربوں اور ترکوں نے ہمیشہ ہی یہودیوں کو عبادت اور اپنے روحانی رشتے کے تسلسل کو قائم رکھنے کی اجازت دی۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوران خلافتِ عثمانیہ نے ان یہودی مہاجرین کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی تھی جن پر یورپ کے عیسائی ممالک میں بے انتہا ظلم ڈھایا جا رہا تھا۔ جب برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر قبضہ کیا تو ملک میں یہودیوں کی آبادی دس فیصد تھی۔ ان کے علاوہ دس فیصد عیسائی تھے اور بقیہ اسّی فیصد مسلمان۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور دوسرے اتحادی طاقتوں کو جرمنی اور خلافتِ عثمانیہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے حمایتیوں کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں کچھ عرب قائدین خلافتِ عثمانیہ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ اس صورتحال سے برطانیہ نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۱۵ء میں عرب قائدین اور برطانیہ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ عربوں کی نمائندگی شریفِ مکہ نے کی تھی اور برطانیہ

کا نمائندہ تھا سر ہنری میک مہون جو اس وقت مصر میں برطانیہ کا ہائی کمشنر تھا۔ شریفِ مکہ نے تمام عرب علاقوں بشمولِ فلسطین کی آزادی کا مطالبہ رکھا تاہم میک مہون نے فلسطین کے تعلق سے گول مول رویہ اپناتے ہوئے کوئی تیقن نہیں دیا۔ شریفِ مکہ نے برطانیہ کے موقف کو رد کر دیا اور یہ تنازعہ ۱۹۳۹ء تک چلتا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب قائدین برطانیہ کی عیارانہ چالوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۶ء میں برطانیہ اور فرانس کے مابین ایک خفیہ معاہدہ (سائکس۔پی کاٹ سمجھوتہ) ہوا تھا جس کی رو سے دونوں اتحادی طاقتوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ فلسطین کو آزادی نہیں دی جائے گی بلکہ اسے ایک بین الاقوامی انتظامیہ کے حوالے کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے صیہونی تنظیم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ فلسطین میں یہودی مملکت قائم کی جائے گی۔ ۱۸۹۷ء میں صیہونی تنظیم نے اعلان کیا تھا کہ ''فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنا'' اس کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں صیہونی قائدین نے برطانیہ سے ربط قائم کیا اور برطانوی حکومت نے صیہونی عزائم کو حقیقت میں بدلنے کے لئے بہت سرگرمی دکھائی۔ برطانیہ کے امور خارجہ کے سکریٹری، لارڈ بیلفور نے ۲ رنومبر ۱۹۱۷ء کو عالمی صیہونی تنظیم کے نام ایک خط لکھا جو ''بیلفور ڈکلریشن'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں صراحت کی گئی تھی: ''ہز میجسٹی کی سرکار فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی مملکت قائم کرنے کے حق میں ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی مساعی کرنے کے لئے تیار ہے.....''

عربوں کی حماقت، برطانیہ کی عیاری اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس ملک میں اسی فیصد مسلمان عرب آباد تھے اسے یہودیوں کی مملکت بنانے کا وعدہ برطانوی حکومت کر رہی تھی۔ جنگ کے خاتمے پر جب لیگ آف نیشنز کا قیام عمل میں آیا تو استعماری طاقتوں نے ایک اور چال چلی۔ یعنی انتدابی نظام (Mandate System) کے تحت جرمنی اور خلافتِ عثمانیہ کے فتح شدہ علاقے مختلف اتحادی طاقتوں کی تحویل میں دیئے گئے۔ فلسطین کے سلسلے میں بیلفور ڈکلریشن پر عمل ہوا اور اسے برطانیہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اس کے بعد عالمی صیہونی تنظیم نے بڑے پیانے پر فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنا شروع کیا جو دنیا کے مختلف ممالک سے لائے گئے تھے۔ نتیجتاً فلسطین میں یہودیوں کی آبادی، جو ۱۹۱۸ء میں ۵۶ ہزار تھی، ۱۹۲۲ء میں ۸۸ ہزار ہوگئی۔ ۱۹۳۹ء کے آتے آتے یہ تعداد چار لاکھ ۴۵ ہزار تک پہنچ گئی۔

صیہونی تنظیم نے برطانوی حکمرانوں کی سرپرستی میں عربوں کو زمین و جائیداد سے بھی بے دخل کرنا شروع کیا۔ اس کے ردعمل میں عرب۔ یہودی فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں برطانوی حکمرانوں نے ہمیشہ یہودیوں کا ساتھ دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانوی حکومت نے فروری ۱۹۴۷ء میں طے کیا کہ مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ تین دہائیوں تک فلسطین پر قابض رہنے کی وجہ سے برطانیہ عربوں کی آبادی اور ان کے مفادات پر ضرب کاری لگا چکا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی جبکہ ۱۹۴۶ء میں ان کی آبادی بڑھ کر چھ لاکھ آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت فلسطین کی جملہ آبادی اٹھارہ لاکھ پچاس ہزار تھی۔

حقِ خودمختاری اقوام متحدہ کے آئین کا ایک بنیادی اصول ہے اور اس کا اطلاق انتدابی نظام کے تحت دیئے گئے تمام ممالک پر ہوا سوائے فلسطین کے۔ فلسطین کے مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے جنرل اسمبلی نے مئی ۱۹۴۷ء میں ایک خصوصی کمیٹی برائے فلسطین (United Nation's Special Commitee on Palastine) تشکیل کی۔ اس کمیٹی کے اراکین کی اکثریت نے یہ سفارش کی کہ فلسطین کو تقسیم کرکے دو علیٰحدہ مملکتیں (عرب اور یہودی) قائم کی جائیں اور یروشلم کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے کر اس کے نظم ونسق کی ذمہ داری اقوام متحدہ کے سپرد کی جائے۔ صیہونی تنظیم نے ان سفارشات کو فوری قبول کرلیا تاہم تمام عرب ممالک نے انھیں رد کردیا۔

فلسطین میں فسادات اور تشدّد کا سلسلہ تو اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب برطانیہ نے اسے اپنی تحویل میں لیا تھا۔ ان سفارشات کے اعلان کے بعد تشدّد کے واقعات آئے دن کا معمول ہوگئے۔ یہودی منظّم دستوں نے برطانوی فوجیوں کی سرپرستی میں عرب اکثریت پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑے جنھیں تاریخ فلسطین کے بدترین واقعات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہودی ہٹلر کے ہاتھوں کئے گئے مظالم کا بدلہ بے قصور عربوں سے لے رہے تھے اور برطانیہ، امریکہ اور فرانس اپنے ''اجتماعی ضمیر'' کی طہارت کے لئے یہودیوں کی اعانت میں مصروف تھے۔

ان خونریز فسادات کے دوران ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا گیا اور جب تک اقوام متحدہ کی افواج ملک میں امن وامان بحال کرتیں اسرائیلی فوجی دستوں نے فلسطین کے ان علاقوں پر (بشمول یروشلم) بھی قبضہ کرلیا جو دراصل عرب فلسطین کو دیئے گئے تھے۔ جب جنگ بندی کا اعلان ہوا تو اسرائیل فلسطین کے ۶۷ فیصد علاقے پر قابض ہوچکا تھا۔ باقی ماندہ علاقوں کا نظم

ونسق مصر اور اردن کے ذمہ کیا گیا۔ اس طرح اسرائیل کا قیام تو ہو گیا لیکن فلسطینی عربوں کی ایک علیٰحدہ مملکت قائم نہ ہو سکی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ ایک انتہائی طاقتور ملک کی صورت ابھرا اور بین الاقوامی سیاست میں امریکی حمایت یا مخالفت حرفِ آخر قرار پائی۔ جنگ کے خاتمہ پر چونکہ یہودی دانشور، سائنسداں اور تاجر بڑے پیمانے پر یورپ کے مختلف ممالک سے ہجرت کر کے امریکہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور امریکی سیاست پر ان کا گہرا دباؤ تھا اس لئے امریکہ قیامِ اسرائیل کے بعد اس یہودی مملکت کا سب سے بڑا حمایتی بن گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسرائیل نے ان عرب علاقوں کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا جن پر وہ غیر قانونی طور پر قابض تھا۔ اقوام متحدہ نے عرب علاقوں کو اسرائیل سے آزاد کرانے کے لئے کئی قراردادیں منظور کیں لیکن امریکی حمایت کے برتے پر اسرائیل نے ان پر عمل کرنے سے سراسر انکار کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کے مسئلہ پر ایک جنگ ہوئی جس میں مغربی طاقتوں نے پھر ایک بار اسرائیل کا ساتھ دیا تاہم مصر کے صدر جمال عبدالناصر نہر سویز کو قومی مملکت قرار دینے میں کامیاب رہے۔

۱۹۶۷ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس کے خاتمے پر فیض نے اپنی نظم "سرِ وادیٔ سینا" لکھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے عرب فلسطین کے بقیہ علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ علاوہ ازیں شام کی گولان پہاڑیاں اور مصر کے سینائی علاقے پر بھی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ اسرائیلی حکومت نے جبراً فلسطینی عربوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ تقریباً پانچ لاکھ سے زیادہ فلسطینی عرب پڑوسی ممالک یعنی لبنان، اردن اور شام میں مہاجروں کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے اسرائیل کے خلاف ایک قرارداد منظور کی جس میں اسے عرب علاقوں کو خالی کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن اسرائیل نے اس قرارداد کا نوٹس تک نہیں لیا۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین (Palastine Libration Organisation PLO) کا قیام ۱۹۶۴ء میں ہوا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس تنظیم نے ۱۹۶۸ء میں اپنا قومی آئین تدوین کیا جس کی رو سے فلسطینی عوام کو اپنے حقوق کی بحالی کے لئے مسلح جدوجہد کی ہدایت کی گئی۔ اسرائیل کو ایک غیر قانونی مملکت قرار دیا گیا اور مکمل فلسطین کی آزادی منزل آخر قرار پائی۔ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی حکومتوں، ذرائع ابلاغ اور اسرائیلی ایجنٹوں نے PLO کو ایک دہشت گرد

تنظیم قرار دیا اور اس پروپیگنڈہ میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ یہ صورتحال سرد جنگ کے خاتمہ تک قائم رہی۔ جب ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا اور سعودی عرب کے ساتھ دوسرے عرب ممالک نے خلیجی جنگ میں عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ ان ممالک کی افواج کو اپنے علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں بنانے کی اجازت دی تو امریکہ نے بادل ناخواستہ PLO اور اس کے لیڈر یاسر عرفات کے تعلق سے اپنا رویہ بدلا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ فلسطینی عربوں کو چند علاقوں میں آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی ہے اور یاسر عرفات برائے نام ان علاقوں کے سربراہ ہیں لیکن یہ حقیقی آزادی نہیں، صرف ڈھکوسلہ ہے۔

تلمیح ۵۱: اختلاج قلب۔

(نظم ''ہارٹ اٹیک'' ص ۵۹)

جیسا کہ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے، فیض نے یہ نظم اختلاجِ قلب کے بعد کہی تھی۔ اس نظم میں کوئی تلمیح تو نہیں لیکن فیض نے اختلاج قلب کے دوران اپنے ذہن و دل پر مرتسم ہونے والے تمام خیالات و جذبات کو بڑی خوبی سے اپنی گرفت میں لے کر انھیں نظم میں ڈھالا ہے۔ اس نظم کے سلسلے میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے ایک مضمون نما مکتوب بنامِ ڈاکٹر محمد حسن کا ایک اقتباس قابلِ غور ہے۔ ظ۔ انصاری لکھتے ہیں: نوکِ قلم پر دستوئیفسکی کا نام آیا تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کے بیان کئے ہوئے ایسے ''دولمحوں'' کی سوانح عمری سناؤں جو لمحے عالمی ادب نے شاید اگلوں کے لئے چھوڑ رکھے تھے۔ ایک پھانسی کے تختے پر چڑھ کر گولی لگنے سے پہلے کے آخری منٹ کا آخری لمحہ، اور دوسرا مرگی کا دورہ پڑنے سے پہلے کا لمحہ۔ دستوئیفسکی واحد شخص ہے جس پر یہ دونوں لمحے گذرے اور اس نے درِ حدیثِ دیگراں کہانی بنا کر من و عن لکھ دی۔ یعنی لمحوں کی ساری تفصیلی کیفیت سپردِ قلم کردی۔ آدمی کی، جانور کی، تاریخ کی، تہذیب کی، ایک دن ایک سال کی سوانح حیات بیان کرنا پھر بھی آسان ہے۔ لمحے کی سوانح حیات (اگر یہ لفظ بامعنی ہو یہاں) بیان کرنا بے حد دشوار ہے۔ اس کے بعد ایک شخص ہے جو فاقہ مست، غزل پرست، نیست و ہست زبانِ اردو کا شاعر فیض جس نے ہارٹ اٹیک (Heart Attack) کے جان لیوا لمحے کو نظم میں باندھ لیا ہے.........''

(ظ۔ انصاری، ''فیض کی موت پر ایک خط'' اردو ادب، شمارہ ۳ اور ۴، ۱۹۸۵ء ص ص ۸۸ و ۸۹)

تلمیح ۵۲: لات و منات

نہیں رہا حرمِ دل میں اک صنم باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند
(نظم "ٹوٹی جہاں پہ کمند" کا پانچواں اور چھٹا مصرعہ، ص ۷۹)

دورِ جاہلیت میں عرب بت پرستی میں پڑ کر دینِ حق کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے خانۂ کعبہ میں کئی دیوی دیوتاؤں کے مجسمے نصب کر رکھے تھے اور دیویوں کو وہ خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔

لات بھی ایک دیوی کا نام تھا جسے دور جہالت میں عرب پوجتے تھے۔ قرآن مجید میں سورۃ النجم کی انیسویں اور بیسویں آیات میں لات کا ذکر اور دو دیویوں کے ساتھ ہوا ہے یعنی عزیٰ اور منات کے ساتھ۔ قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کے بارے میں کیا سوچتے ہو اور تیسری دیوی منات کے بارے میں بھی؟ ان آیات کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ الوقیدی اور الطرابی سے روایت ہے کہ ایک دفعہ مکہ کے معزز شہری خانۂ کعبہ کے قریب جمع ہو کر بحث و مباحثے میں مصروف تھے کہ حضرت محمدؐ وہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے سورۃ النجم کا ورد شروع کیا اور جب آپ انیسویں اور بیسویں آیات پر پہنچے تو شیطان نے بت پرستی کے ساتھ اسلام کی مفاہمت کے نقطۂ نظر سے مشرکانہ الفاظ ان آیات میں خلط ملط کرنا چاہے یعنی "یہ دیویاں عظیم خواتین ہیں اور یقیناً ان کی سفارش کی امید رکھنی چاہئے۔" لیکن حضرت محمدؐ نے ان الفاظ سے انکار کیا کیونکہ حضرت جبرئیل کے ذریعہ ان پر جو وحی نازل ہوئی تھی وہ یوں ہے "تم لات اور عزیٰ کے بارے میں کیا سوچتے ہو اور تیسری دیوی منات کے بارے میں بھی؟" اور سورۃ النجم کی تیئیسویں (۲۳) آیت میں صراحت ہے "یہ نام تم نے ہی انھیں دیئے ہیں، تم نے اور تمہارے اجداد نے اور ان کے تعلق سے اللہ نے کوئی وحی نہیں بھیجی....."

اس واقعہ کا ذکر الوقیدی اور الطرابی نے سورۃ النجم کی تفسیر کے سلسلے میں کیا ہے منات، جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے تیسری اہم دیوی تھی۔ حضرت حسینؓ کے بقول ہرقل اور قزاۃ قبائل کے افراد منات کی پرستش کرتے تھے۔ (ڈکشنری آف اسلام، از ٹامس پیٹرک ہیوز، کاسمو پبلی کیشنز، نئی دہلی ۱۹۸۶، ص ۲۸۵ و ۳۱۳)

تلمیح ۵۳ : بنگلہ دیش۔

(نظم ''حذر کرو مرے تن سے'' ص ۸۵)

بظاہر اس نظم میں بنگلہ دیش کے تعلق سے کوئی براہ راست تلمیح تو نہیں لیکن خود فیض نے اس نظم کے پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا ''یہ نظم اس دردناک واقعہ سے متعلق ہے جسے ہم سب جانتے ہیں، المیہ مشرقی پاکستان۔'' (مطالعہ فیض۔امریکہ اور کینیڈا میں۔'' مولفہ اشفاق حسین، ص ۵۰) فیض کے اس بیان کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ تاریخ پاکستان سے ان سیاسی وجوہات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے جو قیامِ بنگلہ دیش میں ممد ومعاون ثابت ہوئے۔

تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کا واقعہ بنیاد پرست سیاستدانوں کی نظر میں ہوسکتا ہے ایک خوشگوار تاریخی حقیقت ہو لیکن لسانی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تاریخی سانحہ تھا جس کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچا۔ وہ زبان جس میں فیض نے شاعری کی اور مقبولیت پائی۔ یہاں اس بات کا نہ موقع ہے نہ ضرورت کہ تقسیمِ ہند کے تاریخی پس منظر کی تفصیل بیان کی جائے۔ ملک کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیش حکمتِ عملی اور برطانوی حکمرانوں کی سازش کا نتیجہ تھی جس کا خمیازہ آج تک برصغیر کے بچھڑے ہوئے عوام بھگت رہے ہیں۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ قوم کی تشکیل مذہب کی بنیاد پر ہوتی ہے اور چونکہ ہندو اور مسلمان دو مختلف بلکہ متضاد مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ دو مختلف قومیں ہیں۔ دو قومی نظریے کو اساس بنا کر قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیا گیا اور ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ تمام علاقے پاکستان کا حصہ قرار پائے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ لیکن جب بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا تو اس دعویٰ کی قلعی خود بخود کھل گئی کہ صرف مذہب کی بنیاد پر قوم تشکیل پاتی ہے۔

پاکستان بن تو گیا لیکن یہ ملک دو حصوں میں تقسیم تھا۔ مغربی پاکستان میں صوبۂ سرحد، مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے علاقے شامل تھے جبکہ مشرقی پاکستان مشرقی بنگال پر مشتمل تھا۔ ملک کے یہ دونوں حصے لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اور دلچسپ بات یہ کہ پاکستان کی آبادی کا اکثریتی حصہ مشرقی پاکستان میں رہتا تھا۔ مغربی پاکستان میں پنجابیوں کا غلبہ تھا اور اس طرح اقتدار بھی مغربی پاکستان کے قائدین کے ہاتھوں میں تھا۔ مشرقی پاکستان کی حیثیت، باوجود عوامی اکثریت کے، مغربی پاکستان کی نو آبادی سے زیادہ نہیں تھی۔ ملک کے دونوں حصوں کے

درمیان ایک ہزار دو سو میل کا فاصلہ تھا۔

شروع ہی سے پاکستان میں جمہوریت کے پنپنے کے امکانات معدوم تھے۔ پاکستانی فوج میں زیادہ تر پنجابی اور پٹھان افراد شامل تھے اور انتظامیہ میں فوج کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ مغربی پاکستان کے عوام اقلیت میں ہونے کے باوجود اقتدار میں بنگالیوں کو مساوی شرکت دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور یہی رویہ نفاق کا سبب بنا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے خالق محمد علی جناح کا انتقال ہوا اور اس کے بعد پاکستان سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ جناح کی حیثیت پاکستان کے گورنر جنرل کی تھی جبکہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم تھے۔ جناح کی موت کے بعد خواجہ نظام الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا گیا جس کے بعد خواجہ نظام الدین نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ خواجہ نظام الدین کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور ان کے وزیر اعظم بننے کے بعد غلام محمد جو پنجابی تھے، گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ غلام محمد نے ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا ناجائز استعمال شروع کیا۔ دراصل ۱۹۳۵ء کا یہ قانون، ۱۹۴۷ء کے قانون کے نفاذ کے بعد کالعدم ہو چکا تھا لیکن پنجابی، بنگالی نفاق کی وجہ سے غلام محمد ۱۹۳۵ء کے قانون کو از سر نو جاری کرنے پر مصر تھے۔ اس قانون کی رو سے گورنر جنرل کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے خواجہ نظام الدین کو وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا حالانکہ دستور ساز اسمبلی میں انھیں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے بعد محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم بنایا گیا جس کے ساتھ ہی ملک کے دونوں حصوں میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بنگالیوں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ مغربی پاکستان کے قائدین انھیں کبھی بھی ان کے جائز حقوق نہیں دیں گے۔ خواجہ نظام الدین کی برطرفی کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے بنگالی زبان و ثقافت کے تحفظ کی خاطر پر تشدد مظاہرے شروع کئے۔ قیامِ پاکستان کے نتیجے میں برصغیر میں جو خونریز فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تھا ان سے متاثر ہو کر بہار اور مشرقی یو۔پی کے مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گئی تھی۔ تاہم مقامی باشندوں اور مہاجرین میں سوائے مذہب کے اور کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ اس صورتحال نے مشرقی پاکستان کے معاشرے میں تناؤ کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ افراتفری کے اس دور میں ۱۹۵۴ء میں صوبجاتی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے جن میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی۔ حسین شہید سہروردی کی قیادت میں قائم کردہ متحدہ محاذ نے مشرقی پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کی تقریباً تمام نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ فضل الحق کو اتفاق رائے سے مشرقی پاکستان کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔

گورنر جنرل نے پھر ایک دفعہ ۱۹۳۵ء کے قانون کا استعمال کرتے ہوئے فضل الحق کو غیر قانونی طور پر ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ مئی ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل نے نئی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کے لئے انتخابات کروانے کا فیصلہ سنایا اور اسی سال جون کے مہینے میں یہ انتخابات کروائے گئے۔ نئی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس اگست میں شروع ہوا۔ اس نئی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ اقلیت میں تھی۔ اسی اراکین میں صرف ۱۳۵ اراکین مسلم لیگی تھے اور ان سب کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔

نئی دستور ساز اسمبلی نے جو دستور تدوین کیا اس کی رو سے پاکستان ایک اسلامی مملکت قرار پایا اس طرح سیکولرازم کے نظریے کو مسترد کر دیا گیا جبکہ ملک کے دونوں حصوں اور خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہندو اور دوسرے مذاہب کے لوگ قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۵۶ء کی شروعات میں نئے آئین کے تحت اسکندر مرزا پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ حسین شہید سہروردی کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا جو مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی پاکستان کے بنیاد پرست قائدین کی نظروں میں سہروردی کی حیثیت مشتبہ تھی کیونکہ مسلم لیگی قائدین بنگالیوں کو کھرا مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ سہروردی کو بہت جلد وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اسماعیل ابراہیم چندریگر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اسی سال دسمبر میں انھیں بھی اپنے عہدے سے دستبردار ہونا پڑا۔ فیروز خاں نون نے جب وزیر اعظم کے عہدے کا چارج سنبھالا تو ملک کے دونوں حصوں میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اور اپنے اقتدار کی مختصر معیاد (دسمبر ۱۹۵۷ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں وہ ملک کے بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانے میں بالکل ناکام رہے۔ درحقیقت صدر پاکستان اسکندر مرزا اور وزیر اعظم میں اقتدار کے لئے رسہ کشی جاری تھی۔ اسکندر مرزا نے ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک کا آئین منسوخ کر دیا قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں برطرف کر دی گئیں اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہوا اور فیلڈ مارشل ایوب خاں مارشل ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ بیس دنوں بعد یعنی ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایوب خاں نے خود صدر اسکندر مرزا کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔

ایوب خاں نے دس برس سے زیادہ عرصہ تک پاکستان پر حکمرانی کی۔ اس لمبے عرصے میں تمام اختیارات ان کے ہاتھوں میں تھے دوسرے معنوں میں یہ ایک آمرانہ حکومت تھی گو اپنے غیر قانونی اقتدار کو قانونی حیثیت دینے کے لئے انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ایک نیا آئین نافذ کیا جس میں ''اساسی'' یا ''بنیادی جمہوریت'' کا نظریہ مذکور تھا۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس کی رو سے پاکستان میں

بالراست انتخابات کا طریقہ رائج ہوا۔ ان بالراست انتخابات میں اسی ہزار " اساسی جمہوری قائدین" نے ایوب خاں کو پانچ سال کی معیاد کے لئے صدر مملکت منتخب کیا۔

۱۹۶۵ء میں مسئلہ کشمیر پر پھر ایک مرتبہ ہند۔ پاک جنگ چھڑ گئی۔ سوویت یونین کی مداخلت سے جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر پاکستان ایوب خان بات چیت کے لئے تاشقند پہنچے۔ دونوں ممالک کے مابین ایک امن معاہدہ ہوا جو تاشقند معاہدہ کہا جاتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے اس معاہدے کی رو سے دونوں ممالک کی افواج نے ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے خالی کر دیئے۔ سفارتی، معاشی اور تجارتی تعلقات بھی مکمل طور پر بحال ہو گئے۔

تاشقند معاہدہ کی وجہ سے پاکستان میں ایوب مخالف لہر شروع ہوئی۔ اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور ایوب ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ ان حالات کے پیشِ نظر ایوب خان نے مارچ ۱۹۶۹ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رو سے انھیں اپنا استعفیٰ قومی اسمبلی کے اسپیکر کو دینا چاہئے تھا لیکن اس کے برخلاف انہوں نے اپنا استعفیٰ پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو پیش کیا۔ یحییٰ خان عہدۂ صدارت پر قابض ہو گئے اور ملک میں پھر ایک مارشل لا کا نفاذ ہوا

دورِ ایوب میں نہ صرف مشرقی پاکستانیوں بلکہ تمام پاکستانیوں کے جمہوری حقوق اور مفادات تقریباً سلب کر دیئے گئے تھے اور عوام کے دلوں میں فوجی حکمرانوں کے خلاف غم و غصہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں یہ جذبات زیادہ شدید تھے۔ ان حالات میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی سیاسی جماعت عوامی لیگ نے مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مجیب الرحمٰن نے مطالبہ کیا کہ پاکستان میں ایک وفاقی مملکت قائم کی جائے جس کے تحت پاکستان کے دونوں حصے تقریباً خود مختار ہو سکیں۔ وفاقی حکومت کو صرف ملک کے دفاع اور امور خارجہ کے سلسلے میں اختیارات دیئے جائیں۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں انتخابات ہوئے جن میں عوامی لیگ کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی حزبِ مخالف کی صورت میں ابھری۔ آئین کی رو سے مجیب الرحمٰن کو ملک کا وزیر اعظم بننے کا پورا حق تھا لیکن مغربی پاکستان کے فوجی افسران اور سیاسی قائدین عوامی فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا۔ اس کے ردعمل میں مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان پر الزام لگایا کہ وہ بھٹو سے ساز باز کر کے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وسط مارچ ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خان نے

ڈھاکہ میں مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا لیکن جب مجیب الرحمٰن نے اپنی پارٹی کے مطالبات کو منسوخ کرنے سے انکار کر دیا تو انھیں گرفتار کر کے مغربی پاکستان منتقل کیا گیا اور ان پر ملک سے غداری کرنے کا الزام لگا کر مقدمہ دائر کیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں عوام نے مغربی پاکستان کے فوجی افسران اور قائدین کے خلاف مظاہرے شروع کیے۔ اب پاکستانی فوج حرکت میں آئی اور بنگالیوں کا قتل عام شروع ہوا۔ تقریباً ایک کروڑ بنگالی افراد فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ عوامی لیگ کے قائدین نے کلکتہ میں پناہ لی اور وہاں بنگلہ دیش کی حکومتِ جلاوطن قائم کی گئی۔

پناہ گزینوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے جب ہندوستان کی معیشت پر منفی اثر پڑنے لگا تو ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ۳/دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس تنازعہ میں مداخلت کا فیصلہ کیا اور ہندوستانی فوج نے بنگالی مجاہدین آزادی کو بھرپور تعاون دینا شروع کیا۔ اس کے ۱۳/دن بعد یعنی ۲۶/دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۲۰/دسمبر ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کے حوالے کیا اور جنوری ۱۹۷۲ء میں بنگلہ دیش ایک آزاد مملکت کی صورت وجود میں آیا۔ جب دولتِ مشترکہ (Commonwealth of Nations) نے ۱۹۷۲ء کے اخیر میں بنگلہ دیش کی رکنیت بحیثیت ایک آزاد مملکت قبول کی تو پاکستان نے اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ تاہم بھٹو حکومت نے ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کو بطور ایک آزاد مملکت تسلیم کیا اور اس طرح دونوں ممالک میں سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان دولتِ مشترکہ میں دوبارہ شامل ہوا۔

تلمیح ۵۴: رسول حمزہ:

اس مجموعے کے اخیر میں فیضؔ نے ایک عنوان قائم کر کے داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ کے افکار منظوم کیے ہیں۔ ص ۹۳ تا ۱۰۴

رسول حمزہ توف داغستان کے ایک ایسے ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے تھے جہاں شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی۔ بطور شاعر وہ نہ صرف وسط ایشیا بلکہ تمام سوویت یونین میں بے حد مقبول تھے اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں ۱۹۶۲ء میں ان کے شعری مجموعے ''بلند ستارے'' پر ان کو لینن انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ انہوں نے اپنی شعری نگارشات میں عوامی آلام و آزار، خوشیوں اور تمناؤں، مسائل و عزائم کی تخلیقی عکاسی کی ہے۔ ان معنوں میں انھیں بجا طور پر عوامی شاعر

کہا جاتا ہے۔ رسول حمزہ کی شاعری میں ہمیں عہدِ حاضر کے مسائل ور جحانات کا عکس ملتا ہے۔ اپنی شعری نگارشات میں وہ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کا ایک مثبت تصور پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے اپنے ایک مضمون میں رسول حمزہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں انہوں (رسول حمزہ) نے منجملہ دیگر خیالات یہ بھی لکھا ''صرف زبان ہی لوگوں کو قریب نہیں لاتی۔ قربت ہمارے دلوں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ میری مادری زبان اوز بولنے والوں کی تعداد صرف تقریباً تین لاکھ تیس ہزار ہے، لیکن دنیا بھر میں میرے لاکھوں دوست ہیں اور میں جذبات اور طرزِ فکر کے اعتبار سے انھیں بھی اپنا ہم وطن تصور کرتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ثقافتیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں۔ کوہستانی باشندے کا وطن زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔'' (ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، فیض: شاعرِ انسانیت، اردو ادب، فیض نمبر، شمارہ ۳ اور ۴، ۱۹۸۵ء ص ۲۴۳ تا ۲۴۵)

''حقیقی قومی شاعر کو چاہئے کہ وہ اپنے نظریات، جذبات و خیالات کے لحاظ سے اپنے زمانے کا، اپنے عہد کا، اپنے سارے ملک کا شاعر ہو، ہمارا سوویت نظریہ کسی بھی قوم سے اس کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ دوسری قوم کی خاطر اپنی طرزِ زندگی، زبان یا تہذیب کو قربان کر دے۔ اس کے برعکس یہ نظریہ ان کے فروغ کے امکانات کا حامل ہے۔ ہر قوم کے لئے اس بات کے تمام امکانات موجود ہیں کہ وہ انسانیت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے ....صحیح معنوں میں قومی شعراء ہمیشہ بین الاقوامیت پسند ہوتے ہیں۔ وہ کبھی دوسری قوموں کی توہین نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس وہ انہیں دل سے قریب رکھتے ہیں.... میرے چھوٹے سے گاؤں کا نام ''تسادا'' ہے جس کے معنی ہیں ''آگ میں'' ...... میرے والد نے میرا نام رسول رکھا تھا۔ وہ شاعر واقعی خوش قسمت ہے جس کے متعلق اس کے قارئین کہتے ہوں کہ، وہ ہمارے ملک اور ہماری شاعری کا ترجمان ہے، میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ اپنے نام کو پوری طرح حق بجانب ثابت کر چکا ہوں لیکن اس منزل پر پہنچنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا ہوں.... میرا پسندیدہ ٹوسٹ ہے، ''اچھے لوگوں کے عروج اور برے لوگوں کے زوال کے لئے'' (Selected Works: Rasul Hamgatoo، بحوالہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، فیض: شاعر انسانیت، اردو ادب کا فیض نمبر، شمارہ ۳ اور ۴، ۱۹۸۵ء ص ص ۲۴۵ و ۲۴۶) فیض نے رسول حمزہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''رسول حمزہ صرف داغستان کے ملک الشعراء ہی نہیں بلکہ ان کا کلام سوویت یونین کے ہر علاقے میں یکساں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ وہ سوویت پارلیمنٹ کے مجلس صدارت کے رکن یعنی ایک طریقے سے سوویت یونین کے نائب صدر بھی ہیں۔ ان کے اشعار کا ترجمہ تو یہاں کی بیسیوں زبانوں میں ہو چکا ہے۔'' (مہ و سال آشنائی، ص ص ۶۲ و ۶۳)

شامِ شہرِ یاراں

تلمیح ۵۵ : اقبالؔ ۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ در رگِ تاک است

"شامِ شہرِ یاراں" کی شروعات میں پیش گفتار، مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، اشفاق احمد اور شیر محمد حمید کے مضامین کے بعد ص ۳۳ پر اقبالؔ کا مندرجہ بالا شعر نقل ہوا ہے۔

شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ یہ مت سمجھئے کہ پیرِ مغاں کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ہزار ہا لوگ اب بھی باقی ہیں جن کے شراب کے پیالے خالی ہیں۔ مرادی معنوں میں شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ ابھی رہنمائی کا کام ختم نہیں ہوا۔ ہزاروں لوگ منزلِ مقصود سے دور ہیں اور کئی امیدوار ہیں جن کی امیدیں ادھوری ہیں۔ اقبالؔ کے حالات کیلئے دیکھئے تلمیح نمبر ۶۔

تلمیح ۵۶ : اشک آباد ۔

(نظم "اشک آباد کی شام" ص ۴۲)

فیضؔ نے حاشیہ میں یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ اشک آباد ترکمان جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ اب سوویت یونین کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد ترکمانستان ایک خود مختار مملکت ہے۔ اشک آباد ملک کے جنوب۔ مغربی علاقے میں واقع ہے۔ ترکمانستان کا زیادہ تر علاقہ ریگستان ہے۔ اشک آباد غراغم ریگستان کے قریب واقع ایک نخلستان میں آباد ہے۔ اس کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں۔ ابتداء میں یہ شہر ایک روسی قلعہ کے اطراف واکناف آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ قلعہ ۱۸۸۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا تاکہ قافلوں کی آمدورفت پر قابو رکھا جاسکے۔ جب ۱۸۸۵ء میں ٹرانس۔ کیسپین (Trans - Caspian) ریلوے لائن بچھائی گئی اور اشک آباد میں ریلوے اسٹیشن قائم ہوا تو شہر کی ترقی میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۸ء کے ایک زلزلے میں یہ شہر تقریباً مکمل طور پر تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں سوویت یونین کے زیرِ اقتدار اشک آباد کو ترکمان سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں ترکمانستان ایک خود مختار جمہوری ملک بن گیا۔ ۱۹۹۳ء کی اعداد شماری کے مطابق اشک آباد کی کل آبادی پانچ لاکھ سترہ ہزار دو سو تھی۔

اشک آباد اپنے خوبصورت اور معیاری قالینوں کے لئے کافی مشہور ہے۔ اس صنعت کے

علاوہ اس شہر میں جدید مشینوں، شیشہ سازی اور پارچہ بافی کے کارخانے بھی موجود ہیں۔ شہر میں سائنسی علوم کی تحقیق کے لئے ترکمان اکیڈمی آف سائنس (Turkmen Academy of Sciences) ایک مشہور تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی اور ایک میوزیم بھی شہر میں واقع ہے۔ اشک آباد اپنے لذیذ پھلوں کیلئے بھی کافی مشہور ہے۔

ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اشک آباد میں وسط ایشیائی ممالک کی سماجی و ثقافتی ترقی کے لئے یونیسکو (UNESCO) کی جانب سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے فیض احمد فیض نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اشک آباد میں فیض کا قیام دس دن تک رہا اور اسی دوران انہوں نے یہ نظم ''اشک آباد کی شام'' لکھی۔ اس قیام کے دوران ان کی ترجمان سویتلانا ایمینو داتھی اور یہ نظم فیض نے اسے ہی نذر کی تھی۔

تلمیح ۵۷: سجاد ظہیر

(نظم ''سجاد ظہیر کے نام''، ص ۴۸ و ۴۹)

سجاد ظہیر کا شمار ترقی پسند تحریک کے اہم ترین قائدین میں ہوتا ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال ماسکو میں ہوا۔ اس وقت وہاں فیض بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ جنازے کے ساتھ دہلی آئے اور دہلی ہی میں انہوں نے اپنے رفیقِ دیرینہ کے لئے یہ منظوم نذرانہ عقیدت قلم بند کیا۔ فیض اور سجاد ظہیر میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد سجاد ظہیر وہاں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ پھر فیض کے ساتھ انھیں بھی راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا گیا اور دونوں کچھ مدت تک جیل میں بھی ساتھ رہے۔

سجاد ظہیر کا پورا نام سید سجاد ظہیر تھا اور بنے بھائی عرفیت۔ وہ ۵ نومبر 1905ء کو لکھنؤ میں ایک معزز اور متموّل خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں زندگی بھر ہر طرح کی آسائش، ماحول کی نفاست اور نام و نمود کے مواقع حاصل رہے۔ انگلستان میں تعلیم پائی اور جب ۱۹۳۱ء کے بعد ہندوستان میں اشتمالی تحریک نے زور پکڑا تو یہ ہندوستان لوٹ آئے۔ انہوں نے پریم چند اور ملک راج آنند کے تعاون سے انجمنِ ترقی پسند مصنفین قائم کی۔ ''انگارے'' کے افسانوں سے انھیں ادب میں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رکنیت کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں شہرت ملی۔ ان کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اردو ناول نگاری میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۸ء بمبئی میں

رہے اور پھر پاکستان چلے گئے ۔ راولپنڈی سازش کیس میں انھیں چار سال قید کی سزا سنائی گئی ۔ ضمانت پر رہائی کے بعد ہندوستان میں لوٹ آئے اور آخر دم تک ترقی پسند تحریک کو منظم کرنے میں مصروف عمل رہے۔

سجاد ظہیر اس لحاظ سے اردو میں انوکھی شخصیت کے مالک تھے کہ انہوں نے بہت کم لکھا لیکن کئی بہت اچھا لکھنے والوں کو بھی وہ درجہ، وہ مقبولیت، وہ وقار اور محبت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے حصے میں آئی ۔ مذکورہ بالا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کے علاوہ 'روشنائی' اور 'پگھلا نیلم' (شعری مجموعہ) بھی ان کی تصانیف ہیں۔

تلمیح ۵۸ : ''ڈھاکہ سے واپسی پر''

(نظم، ص ۶۰)

دراصل یہ غزل ہے لیکن چونکہ مضمون میں تسلسل قائم ہے اس لئے فیضؔ نے اس کا ایک عنوان بھی مقرر کر دیا ہے۔ قیامِ بنگلہ دیش کے تقریباً چار سال بعد پاکستان کا ایک وفد بنگلہ دیش مدعو کیا گیا تھا جس میں فیضؔ بھی شامل تھے ۔ یہ غزل نما نظم فیضؔ نے اسی دورے سے واپسی کے بعد لکھی تھی۔ اس غزل (نظم؟) کے مطلع کے تعلق سے ایک بات کا ذکر ضروری ہے ۔ جب یہ غزل پہلی دفعہ شائع ہوئی تو مطلع یوں تھا۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

پاکستان کی مشہور مغنیہ نیرہ نور نے بھی اسے مندرجہ بالا صورت ہی میں گایا ہے ۔ بعد میں شاید فیضؔ کو زبان کی غلطی کا احساس ہوا ۔ مصرعہ اولیٰ میں لفظ مُداراتوں اس لئے غلط ہے کہ عربی، فارسی لفظ مُدارا بمعنی خاطر تواضع کا صیغہ جمع مُدارات ہے ۔ مُداراتوں تو جمع کی جمع ہو گیا۔ اسلئے فیضؔ نے مداراتوں کو بدل دیا۔ زیرِ نظر کلیات میں مطلع اس طرح ہے

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

بنگلہ دیش کی تفصیل کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۵۳

تلمیح ۵۹ : امیر خسروؒ

(گیت ''موری ارج سنو'' نذر خسرو، ص ص ۶۷ و ۶۸)

اس گیت کا پہلا بند امیر خسروؒ کے ہندوی گیت سے مستعار ہے۔ گو یہ بات تا حال متنازعہ فیہ ہے کہ وہ سارا ہندوی کلام جو امیر خسروؒ سے منسوب ہے واقعی انھیں کا ہے۔ تاہم عام روایات یہی ہے کہ امیر خسروؒ نے ہندوی میں بھی شاعری کی تھی اور یہ گیت ''موری ارج سنو دست گیر پیر'' انھیں کا گیت کہا جاتا ہے۔

امیر خسرو ۱۲۵۲ء میں مومن آباد پٹیالی، ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین تیرھویں صدی عیسوی کی شروعات میں ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا اصلی نام ابوالحسن اور تخلص خسروؒ تھا۔ جلال الدین خلجی نے انھیں امیر کے خطاب سے نوازا تھا اسی لئے امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوئے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ کی ابتداء امیر خسروؒ کے نام سے ہوتی ہے گو وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن انہوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے چند قطرے اردو کے خون میں بھی شامل کئے۔ امیر خسروؒ ایک کثیر الجہت شخصیت کے حامل تھے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت پر عالمانہ دستگاہ کے ساتھ ساتھ ہندوی اور دیگر کئی مقامی بولیوں پر دسترس رکھتے تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ میدانِ موسیقی میں خیال، ایمن، قول، ترانہ وغیرہ راگوں کے علاوہ ستار اور طبلہ بھی انہی کی ایجادات ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید خاص تھے۔

امیر خسروؒ کی تمام تصانیف کی تعداد سو سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے بقول ان کی تصانیف کی تعداد ۹۹ ہے تاہم تا حال صرف ۲۸ کتب دستیاب ہیں۔ امیر خسروؒ نے نو بادشاہوں کا عہد دیکھا اور چھ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اور ایک روایت کے مطابق سترہ، اٹھارہ برس کی عمر ہی میں وہ ایک مشہور شاعر بن گئے تھے۔ ان کے اشعار کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کرتی ہے۔ خسرو کا اردو (ہندوی) کلام دستیاب ہے لیکن اس میں امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ محققین کے خیال میں اسے مستند نہیں مانا جاسکتا۔ تاہم بے شمار کہاوتیں، دو سخنے، انمل، ضرب المثال، مکرنیاں اور متعدد اشعار ان کے نام سے منسوب ہیں۔ ان کے اردو کلام میں ''خالق باری'' بھی شامل ہے۔ ان کا سب سے مشہور دوہا درج ذیل ہے

جوانہوں نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات پر کہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہوں دیس

امیر خسرو نے ۱۳۲۵ء میں دہلی میں انتقال کیا اور درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے احاطے میں دفن ہوئے۔

تلمیح ۲۰ : مسیحا۔

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی
(غزل کا دوسرا شعر، ص ۶۹)

مسیحا کی تفصیل کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۲

تلمیح ۲۱ : لینن گراڈ۔

(نظم ''لینن گراڈ کا گورستان'' ص ص ۷۳ و ۷۴)

۱۹۷۶ء میں فیضؔ نے جب یہ نظم لکھی تھی تب سوویت یونین موجود تھا اور ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے موجود تھا۔ اس نظم میں فیضؔ نے جس شہر کے گورستان کی منظر کشی کی ہے اس وقت اس کا نام لینن گراڈ ہی تھی۔ لیکن ۱۹۹۱ء کے بعد سوویت یونین میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کے سبب اس بڑی طاقت کا نقشہ ہی بدل گیا جسے فیضؔ سوویت یونین کے نام سے جانتے تھے۔ آج یہ ملک کٹ کٹا کر کئی آزاد اور خود مختار ممالک کا وفاق (Confederation) بن چکا ہے۔ ان میں روس ہی سب سے بڑا ملک ہے۔

آج لینن گراڈ اپنے پرانے نام یعنی سینٹ پیٹرز برگ سے جانا جاتا ہے کیونکہ روس کا موجودہ سیاسی ماحول پرانی اشتمالیت یا اشتمالی دورِ حکومت کی علامتوں کو قائم رکھنے کے موافق نہیں ہے۔ شہر سینٹ پیٹرس برگ کی داغ بیل اس حکمراں نے ڈالی تھی جس کی شخصیت کو جدید روس کی تاریخ کا نقطۂ آغاز کہا جاتا ہے اور جس کا دورِ حکومت ۱۶۹۴ تا ۱۷۲۵ء پر محیط رہا۔ پیٹر ایک منفرد کردار کا مالک تھا۔ وہ روس کے شاہی خاندان زار (Czars) میں پیدا ہوا لیکن اس کی تعلیم و تربیت اس مروجہ

طریقے پر نہ ہو سکی جو شہزادوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی وجہ خود پیٹر کا سیماب صفت کردار تھا۔ وہ اپنی مرضی و منشاء سے تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا اور ایسا ہر علم یا حرفت سیکھنا چاہتا تھا جو اس کی نظروں میں کار آمد یا مفید تھی۔ وہ ایک اچھا بڑھئی ہونے کے علاوہ دانتوں کا ڈاکٹر بھی تھا۔ جثہ کے لحاظ سے وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس کا قد تقریباً سات فٹ تھا۔ کریملن کی میوزیم میں آج بھی ایک بہت بڑے سائز کے جوتوں کا جوڑا رکھا ہوا ہے جسے اس نے خود بنایا تھا۔

لڑکپن میں اتفاق سے ایک ایسی برطانوی کشتی پیٹر کے ہاتھ لگی جو بادِ مخالف میں بھی سفر کر سکتی تھی۔ پیٹر اسے پا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کشتی کی مرمت کروائی اور بادبانی میں جوش و خروش سے دلچسپی لینی شروع کی۔ وہ ایک بحری فوج بنانا چاہتا تھا لیکن ماسکو کے قریب سمندر نہ ہونے کی وجہ سے اس انے روس کی سرحدوں کو بحرِ بالٹک تک پھیلانا چاہا۔ اس منصوبے میں اسے کامیابی نہ مل سکی کیونکہ سوئیڈن کی مملکت اس کے آڑے آئی۔ سترہویں صدی عیسوی میں سوئیڈن کی فوجی طاقت تمام یورپ میں دوسرے ممالک سے برتر تھی۔

چونکہ پیٹر پر بادبانی کا جنون سوار تھا اس لئے وہ سمندر کے قریب قیام پذیر ہونا چاہتا تھا۔ دریائے نیوا (Neva) کے دہانے کے مضافات میں جہاں آج سینٹ پیٹر ذبرگ واقع ہے، صدیوں سے سلاوک (Slavic) قبائل آباد تھے۔ دسویں صدی عیسوی کے دوران یہ علاقہ روس میں شامل کر لیا گیا۔ دریائے نیوا کا اختتام خلیج فن لینڈ میں ہوتا ہے جو بحر بالٹک سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے عرصہ دراز سے دریائے نیوا روس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ممالک کے مابین تجارت کا اہم ترین بحری راستہ تھی۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس پورے علاقے پر سوئیڈن کا قبضہ ہو چکا تھا۔

۱۶۹۴ء میں جب پیٹر تخت نشین ہوا تو اس کے سامنے سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ دریائے نیوا کے مضافات کو پھر سے روس کا حصہ بنا کر وہاں ایک نیا شہر تعمیر کیا جائے۔ ۱۷۰۰ء میں اس تنازعہ پر روس اور سوئیڈن میں جنگ چھڑ گئی جو بڑی شمالی جنگ کے نام سے موسوم ہے۔ روس کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوئی اور اس طرح روس کے سرحدیں سمندر سے جا ملیں۔ جنگ کے دوران ہی پیٹر کے حکم سے ایک جزیرے پر بغرض دفاع ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ ۲۷ مئی ۱۷۰۳ء کو اس قلعہ کی تعمیر کا کام ختم ہوا اور اس کا نام پیٹر اور پال کا قلعہ رکھا گیا۔ اسی تاریخ کو شہر پیٹرز برگ کا یوم تاسیس مانا جاتا ہے۔

سینٹ پیٹرز برگ کی تعمیر میں ان گنت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سینکڑوں معمار دورانِ تعمیر ڈوب کر مر گئے لیکن پیٹر اپنے ارادے پر قائم رہا۔ جب شہر کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تو اس کا شمار دنیا کے

خوبصورت ترین شہروں میں ہونے لگا۔ ۱۷۱۲ء میں پیٹر نے اپنا پایہ تخت ماسکو سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کیا۔ اس کے بعد دو سو برس تک یہ شہر روس کا دار الحکومت رہا۔ پیٹر اس شہر کو "دریچہ یورپ" کہا کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں شہنشاہ نکولس دوم نے اس کا نام بدل کر پیٹروگراڈ کر دیا۔ بولشویک انقلاب کے بعد دار الحکومت پھر ایک بار ماسکو قرار پایا لیکن پیٹروگراڈ کا نام تبدیل نہیں ہوا۔ جب ۱۹۲۴ء میں لینن کا انتقال ہوا تو اس عظیم انقلابی رہنما کی یاد میں اس شہر کا نام لینن گراڈ رکھا گیا تھا۔ جب روس میں اشتمالیوں کی جدوجہد شروع ہوئی تو سینٹ پیٹرز برگ انقلابی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔ اسی شہر میں لینن نے سوویت روس کے قیام کا اعلان کیا تھا۔

۱۹۹۲ء کی مردم شماری کے مطابق سینٹ پیٹرز برگ کی آبادی ۴۴ لاکھ، چھتیس ہزار سات سو تھی اور یہ روس کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک ہزار سات سو کتب خانے موجود ہیں۔ سب سے بڑی لائبریری کا نام سالتی خف۔ شیڈرن لائبریری (Saltykov- Shchdrin Library) ہے جس میں دو کروڑ پچاس لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔

تلمیح ۲۲ : حضرت امام حسینؓ

("مرثیہ امام" ص ص ۸۵ تا ۹۱)

"شام شہر یاراں" میں فیضؔ نے ان شعری تخلیقات کو بھی شامل کیا ہے، جو انہوں نے کسی نہ کسی کی فرمائش پر لکھی تھیں اور اس حصے کا نام "فرمائشیں" مقرر کیا ہے۔ اس حصے میں سب سے پہلے حضرت امام حسینؓ کا مرثیہ شامل ہے۔ فیضؔ مرثیے کے میدان کے آدمی نہیں تھے اس لئے اس مرثیے میں وہ محاسن تلاش کرنا جو میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں میں موجود ہیں، فیضؔ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ سانحہ کربلا کے چند واقعات کو منظوم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

سانحۂ کربلا اور شہادتِ حضرت امام حسینؓ تو تقریباً ہر مسلمان اور ہر اردو داں جانتا ہے پھر بھی انسانی تاریخ کے اس بد بخت ترین واقعہ کا مختصر احوال پیش ہے۔ فیضؔ کے "مرثیہ امام" کا پہلا مصرعہ ہے ؎

رات آئی ہے، شبیر پہ یلغار بلا ہے

شبیر، سیدنا امام حسینؓ کا نام تھا جس کے لغوی معنی خوب اور نیک کے ہیں۔ حضرت امام

حسینؓ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب سید الشہداء اور سبطِ اصغر ہے۔ وہ رسولِ پاک کے نواسے اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ زہرا کے لختِ جگر تھے۔ اسلامی تاریخ میں حضرت امام حسینؓ کا قصہ انتہائی دردناک ہے۔

امیر معاویہ کے بعد جب ان کے بیٹے یزید نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو وہ اس بات پر بھی مصر ہوا کہ حضرت امام حسینؓ اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ انہوں نے اس بدکار شخص کے کردار اور اس کے فسق و فجور کے پیشِ نظر بیعت سے انکار کر دیا۔ ادھر کوفہ (جو اس وقت عراق کا صدر مقام تھا) کے لوگوں نے کئی مرتبہ خطوط کے ذریعہ حضرت امام حسینؓ کو دعوت دی کہ وہ یزید کے خلاف جنگ کریں جس میں اہل کوفہ ان کا ساتھ دیں گے۔ حضرت امام حسینؓ اپنے اہل خاندان اور اصحاب کو لے کر کربلا کے مقام پر پہنچے جو کوفہ سے ۲۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ اہل کوفہ نے دغا کی اور حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس لئے اسلام کی ادبی روایات میں کوفیوں کا ذکر غداری اور دھوکہ دہی کے ضمن میں ہوتا ہے۔ اب اہل بیت کے ۷۲ افراد کا مقابلہ یزید کی فوج سے تھا جس کی قیادت عمر سعد کر رہا تھا۔ یزید کی فوج نے دریائے فرات پر بھی اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔ حضرت امام حسینؓ اور ان کے عزیز و اقارب کو تپتے ہوئے صحرا میں پانی کا ایک قطرہ تک میسر نہیں تھا۔ بربریت کی انتہاء دیکھئے کہ جب حضرت امام حسینؓ نے اپنے شیر خوار بیٹے علی اصغر کی پیاس بجھانے کیلئے پانی حاصل کرنا چاہا تو یزید کے سپاہیوں نے ان پر تیر برسائے اور وہ معصوم اپنے والد کی گود ہی میں شہید ہو گئے۔

تمام نامساعد حالات کے باوجود حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھی حق اور صداقت کے لئے جنگ کرتے رہے اور انہوں نے یزید کی فوج کے کئی سپاہیوں کو مار کر شہادت کا جام پیا۔ یہ حادثہ بروز جمعہ، عاشورہ کے دن یعنی دس محرم ۶۱ھ - ۶۸۰ء کو واقع ہوا۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ کی عمر پچپن برس اور کچھ مہینے تھی۔

سانحۂ کربلا کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۶۵

تلمیح ۶۳ : حسین شہید سہروردی

حصہ ”فرمائشیں“ میں ایک ”مدح“ (ص ص ۹۲ تا ۹۵) بھی شامل ہے اور ممدوح کے تعلق سے خود فیض نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ حسین شہید سہروردی مرحوم تھے جنہوں نے راولپنڈی سازش کیس میں ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی۔ مقدمے کے خاتمہ پر یہ مدح انھیں بطور سپاسنامہ پیش

کی گئی تھی۔ راولپنڈی سازش کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۶۲

تلمیح ۶۴ : جم و دارا۔

("مدح" کا دوسرا حصہ، ص ۹۴)

جم ودارا کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۷

تلمیح ۶۵ : شمر ع

ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی

("مدح" کا دوسرا حصہ، ص ۹۴)

تاریخِ اسلام میں سانحۂ کربلا سب سے زیادہ الم ناک حادثہ ہے۔ حضرت امام حسینؑ بن علیؑ کی شہادت جبر و ظلم، جھوٹ اور مکر و فریب کے خلاف حق گوئی اور بہادری کی عمدہ ترین مثال ہے۔ شمر کا نام تاریخ میں حضرت امام حسینؑ کے طفیل صرف اس لئے زندہ رہ گیا کہ وہ ان کے قاتلوں میں سے ایک تھا اور آج اس کا نام بغض و کینہ، سفاکی اور کمینگی کا استعارہ بن چکا ہے۔

عام مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ شمر نے حضرت امام حسینؑ کو ذبح کر کے ان کا سر کاٹا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ درست نہیں ہے۔ اردو میں سانحۂ کربلا کی مستند ترین تاریخ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھی ہے۔ (شہیدِ اعظم، از مولانا ابوالکلام آزاد، تاج پبلیشرز، دہلی) شمر کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے کے لئے یہاں اسی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

واقعہ کربلا کے دوران ایک ایسی صورت بھی پیدا ہوئی تھی جس پر عمل درآمد کیا جاتا تو تاریخِ اسلام کا یہ بدبخت سانحہ وقوع پذیر نہ ہوتا اور اہلِ کوفہ ایک ناپاک اور گھناونے جرم کے مرتکب نہ بنتے۔ لیکن یہ شمر ہی تھا جس نے کوفہ کے حاکم عبیداللہ بن زیاد کو صلح صفائی اور امن کا راستہ اختیار کرنے سے باز رکھا اور اپنی شر پسندی اور کمینگی کا ثبوت دیا۔ اس کے دل میں حضرت امام حسینؑ کے تعلق سے بغض و کینہ تھا اور اس نے اپنی تقریروں سے اہلِ کوفہ کو رسولؐ کے نواسے کا قتل کرنے پر اکسایا۔ ان معنوں میں وہ حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے قاتلوں میں سب سے زیادہ مردود اور قابلِ نفریں قرار پاتا ہے۔

حضرت امام حسین ۲ محرم ۶۱ ھ ـ ۶۸۰ء کو ایک اجاڑ اور بے آب و گیاہ مقام 'کربلا'

پہنچے۔ دوسرے دن کوفہ کے حکمران عبید اللہ بن زیاد نے عمرو بن سعد کو چار ہزار فوج کے ساتھ حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا۔ عمرو بن سعد نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ آلِ نبیؐ کے قتل سے رنگے جائیں۔ اس نے کربلا پہنچ کر حضرت امام حسینؓ سے تین چار دفعہ ملاقاتیں کیں، جن کے بعد حضرت امام حسینؓ نے جنگ کو ٹالنے کے لئے "تین صورتیں پیش کی تھیں:

۱- مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں۔

۲- مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو۔

۳- مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر جو گذرتی ہے وہی مجھ پر گذرے گی۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ایضاً ص ص ۲۳ و ۲۴)

عمرو بن سعد نے جب یہ شرطیں سنیں تو مطمئن ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح جنگ کو ٹالا جاسکتا ہے۔ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو خط لکھا جس کا متن آزاد نے نقل کیا ہے:

"خدا نے فتنہ ٹھنڈا کر دیا۔ حسینؓ مجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ان تین صورتوں میں سے کسی ایک کے لئے تیار ہیں۔ اس میں تمہارے لئے بھی بھلائی ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ایضاً ص ۲۴)

عبد اللہ بن زیاد خود ایک سفاک اور بدکار حاکم تھا اور حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ تاہم جب اس نے عمرو بن سعد کا خط پڑھا تو صلح صفائی کا راستہ اختیار کرنے پر راضی ہو گیا۔ شمر نے جب یہ صورتحال دیکھی تو عبید اللہ کو ورغلایا اور حضرت امام حسینؓ کی مجوزہ شرائط کی مخالفت کی۔ اس نے عبید اللہ سے کہا، "حسینؓ قبضے میں آ چکے ہیں۔ اگر بغیر آپ کی اطاعت کے نکل گئے تو عجب نہیں پھر عزت وفوج حاصل کر لیں اور آپ کمزور و عاجز قرار پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ اب انھیں قابو سے نکلنے نہ دیا جائے جب تک وہ آپ کی اطاعت نہ کر لیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسینؓ اور عمرو باہم رات رات بھر سرگوشیاں کیا کرتے ہیں" (ابوالکلام آزاد، ایضاً ص ۲۴)

اس طرح شمر کے ورغلانے پر عبید اللہ بن زیاد نے امام حسینؓ کی شرائط مسترد کر دیں، اور بالآخر ایک بدترین جرم کا مرتکب ہوا۔ شمر کے تعلق سے آزاد لکھتے ہیں:

"شمر بن ذی الجوشن کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی پھوپھی ام البنین

بنتِ خرام امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ، کی زوجیت میں تھیں اور ان ہی کے بطن سے ان کے چار صاحبزادے، عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان پیدا ہوئے تھے جو اس معرکہ میں امام حسینؓ کے ساتھ تھے۔ اس طرح شمر ان چاروں اور ان کے واسطے سے حضرت امام حسینؓ کا پھوپھیرا بھائی تھا۔ اس نے ابن زیاد سے درخواست کی تھی کہ اس کے ان عزیزوں کو امان دے دی جائے اور اس نے منظور کرلیا تھا۔ چنانچہ میدان میں چاروں صاحبزادوں کو بلا کر کہا 'تم میرے دادھیالی ہو۔ میں نے تمہارے لئے امن وسلامتی کا سامان کرلیا ہے، لیکن انھوں نے جواب دیا، 'افسوس تم پر۔ تم ہمیں تو امان دیتے ہو لیکن فرزند رسولؐ کے امان نہیں ہے۔" (ابوالکلام آزاد، ایضاً، ص ۲۵)

دسویں محرم (عشرہ) بروز جمعہ جنگ کا باضابطہ آغاز ہوا۔ فجر کی نماز کے بعد عمرو بن سعد نے حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ حضرت امام حسینؓ کے ساتھیوں نے اپنے خیموں کے پیچھے خندقیں کھود کر ان میں آگ لگادی تاکہ عقب سے حملہ نہ کیا جاسکے۔ شمر نے جب یہ دیکھا تو چلا کر کہا، "اے حسین، قیامت سے پہلے ہی تو نے آگ قبول کرلی؟" حضرت حسینؓ نے جواب دیا "اے چرواہے کے لڑکے! تو ہی آگ کا زیادہ مستحق ہے۔" مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا "مجھے اجازت دیجئے اسے تیر مار کر ہلاک کرڈالوں کیونکہ بالکل زد پر ہے۔" حضرتؓ نے منع کیا "نہیں، میں لڑائی میں پہل نہیں کروں گا۔" (مولانا ابوالکلام آزاد، ایضاً، ص ۳۱)

یہاں اس عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے کہ شمر نے حضرت امام حسینؓ کا سر کاٹا تھا۔ آزاد حضرت حسینؓ کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "......اب وقت آچکا تھا۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے آپ کے بائیں ہاتھ کو زخمی کیا، پھر شانے پر تلوار ماری۔ آپ کمزوری سے لڑکھڑائے۔ لوگ ہیبت سے پیچھے ہٹے مگر سنان انس نخعی نے بڑھ کر نیزہ مارا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس نے ایک شخص سے کہا "سر کاٹ لے" وہ سر کاٹنے کے لئے لپکا مگر جرأت نہ ہوئی۔ سنان بن انس نے دانت پیس کر کہا "خدا تیرے ہاتھ شل کرڈالے۔" پھر جوش سے اترا۔ آپ کو ذبح کیا اور سر تن سے جدا کرلیا۔" (ابوالکلام آزاد، ایضاً، ص ۴۹)

ان واقعات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سانحہ عظیم کے پیچھے شمر بن ذی الجوشن کا فتنہ پرور دماغ ہی کارفرما تھا۔ اس نے اپنے ناپاک عمل سے واقعہ کربلا کے دوران سفاکی اور کمینگی

کے بدترین نمونے پیش کئے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد شمر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آپ کے خیمے میں گھسا۔ ''وہاں زین العابدین بستر پر بیمار پڑے تھے۔ شمر کہنے لگا، اسے بھی قتل کیوں نہ کر ڈالیں۔'' (ابوالکلام آزاد، ایضاً، ص ۵۰) لیکن عین وقت پر وہاں عمرو بن سعد پہنچ گیا اور شمر کو ایک ذلیل حرکت کرنے سے روکا۔ یہ شمر ہی تھا جس نے دوسرے کوفیوں (بن الاشعث، عمرو بن الحجاج اور مرہ بن قیس) کی مدد سے امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے کٹے ہوئے سر عبیداللہ بن زیادہ کے پاس لے گیا۔ بعد ازاں یہ شمر ہی تھا جس کی سرداری میں اہل بیت کی خواتین اور امام زین العابدین کو دمشق میں یزید کے پاس پہنچایا گیا۔

تلمیح ۶۶ : قربانیٔ شبیرؑ

ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبیر
(''مدح'' کا دوسرا حصہ، ص ۹۴)

شہادت امام حسینؓ کے لئے دیکھئے تلمیحات ۶۲ اور ۶۵

تلمیح ۶۷ : ناظم حکمت

''شام شہر یاراں'' میں پنجابی کلام بھی ہے اور منظوم تراجم بھی۔ تراجم کے حصے میں فیضؔ نے ناظم حکمت کی تخلیقات کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ (ص ۱۲۳ تا ۱۲۸) ناظم حکمت کے تعلق سے فیضؔ نے حاشیے میں لکھا ہے، ''ترکی کا شہرہ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کی جنگِ حریت میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گذاری۔ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔''

ناظم حکمت کا شمار ترکی کے اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی جرمنی کے ساتھ تھا۔ اس وقت مشرقی یورپ کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر تمام وسط ایشیاء کے ممالک خلافت عثمانیہ کے زیر اقتدار تھے۔ برطانوی استبداد کے بعد خلافتِ عثمانیہ سب سے بڑی ایمپائر تھی جسے مغربی طاقتیں بہر صورت نیست و نابود کرنا چاہتی تھیں۔ برطانیہ ان سازشوں میں پیش پیش تھا۔ ایک برطانوی ایجنٹ، ٹی۔ ای۔ لارنس نے عربوں کو ترک حکمرانوں کے خلاف ورغلانے اور بغاوت کرنے پر اکسایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کو وسطی ایشیا میں عرب عوام کی حمایت حاصل نہ ہو سکی اور ترک فوجوں کو کئی محاذوں پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کے ساتھ ساتھ ترکی کو بھی شکست ہوئی اور وسط ایشیا کے تمام عرب علاقے ترکی سے چھین لئے گئے۔

دورانِ جنگ اور اس کے خاتمہ پر ناظم حکمت نے اپنی شاعری کے ذریعہ ترکی کی حریت اور حمیت قائم رکھنے کی تبلیغ کی۔ جنگ کے بعد ترکی میں کمال اتاترک برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے ملک کی از سرِ نو تعمیر اور ترقی کے لئے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اتاترک کی وطن پرستی سے ناظم حکمت کو بھی اتفاق تھا تاہم وہ حب الوطن ہونے کے ساتھ ساتھ انسان دوست بھی تھے۔ وہ پسماندہ اور استحصال شدہ عوام کے ہمدرد اور رہنما تھے۔ وہ بولشویک انقلاب سے بہت متاثر ہوئے۔ ان تمام خیالات ونظریات کو ناظم حکمت نے اپنی شاعری میں برتا اور اسی سبب قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔
فیضؔ بھی وطن پرست ہونے کے علاوہ انسان دوست اور اشتمالی نظریات کے داعی تھے اور اسی سبب انھیں ناظم حکمت سے عقیدت تھی۔ فیضؔ نے ناظم حکمت کے بارے میں کہا تھا، "ناظم حکمت کو ترکی کا علامہ اقبالؔ سمجھ لو۔ علامہ مرحوم نے مزدوروں کے گیت لکھے مگر مزدوروں کی عملی سیاست میں نہیں الجھے اور سیدھے معرفت کی طرف نکل گئے۔ ناظم حکمت الجھ گئے اور رفتہ رفتہ کمیونسٹ ہو گئے۔"

تلمیح ۶۸ : یاسر عرفات

(انتساب، ص ۳)

فیض کے اس مجموعے کا انتساب یاسر عرفات کے نام ہے۔ فیض نے اپنی زندگی کے آخری کئی برس بیروت میں گذارے جہاں وہ افرو۔ ایشیائی تخلیق کاروں کے جریدے "لوٹس" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس دوران انھیں فلسطینی عوام کی جدوجہدِ آزادی کو بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ بطور ایک لبرل دانشور اور شاعر فیض دنیا بھر کے محکوم و مجبور عوام کی آزادی اور خود مختاری کیلئے آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھتے تھے اور فلسطین سے تو ویسے بھی ثقافتی اور مذہبی وابستگی کے سبب انھیں جذباتی لگاؤ رہا۔ بیروت ہی میں فیض کی ملاقات فلسطینی تحریکِ آزادی کے قائد یاسر عرفات سے ہوئی اور بہت جلد دونوں میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ جب رسالہ "فن اور شخصیت" ممبئی نے فیض نمبر کا پلان بنایا تو یاسر عرفات نے اس وقت ایک تہنیتی پیغام روانہ کیا تھا جو اس نمبر میں شامل ہے۔

یاسر عرفات کا اصلی نام رحمٰن بن عبدالرؤف عرفات القدوئی الحسینی ہے۔ وہ ۲۷/اگست ۱۹۲۹ء کو بیت المقدس (یروشلم) میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی مکان یہودیوں کی مقدس جگہ دیوار گریہ کے قریب واقع تھا۔ جس دن یاسرِ عرفات کی ولادت ہوئی اس روز یہودیوں اور مقامی فلسطینیوں کے درمیان زبردست فساد برپا تھا جس میں ان کے والد اور دوسرے افراد خاندان بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یاسر کے والد تجارت پیشہ تھے اور ان کی جائیداد قاہرہ میں بھی تھی۔ رحمٰن بن عبدالرؤف، یاسر عرفات کے نام سے کیوں مشہور ہوئے اس بات کو جاننے کے لئے ہمیں ان کے استاد مجید حلبی کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہوگی۔

مجید حلبی پیرس کے تعلیم یافتہ باشعور شخص تھے فلسطین ان دنوں برطانیہ کی نو آبادی تھا اور برطانیہ ہی کی سازش سے دنیا بھر کے یہودی فلسطین میں جمع ہو رہے تھے۔ برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں "بیلفور ڈکلریشن" کے ذریعہ یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہودیوں کی مملکت فلسطین میں قائم کی جائے گی جس کے بعد برطانوی حکمرانوں کی ایما پر دنیا بھر کے یہودی فلسطین میں آباد ہونے شروع ہوئے۔ ان نو وارد یہودیوں اور مقامی فلسطینیوں میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور دونوں اقوام نے دہشت گردوں کی کئی خفیہ تنظیمیں بنالیں۔ برطانوی حکمران علی الاعلان یہودیوں کی طرفداری کرتے تھے اور

دنیا بھر کے دولت مند یہودیوں کی اعانت سے فلسطین میں آباد یہودیوں کو جدید طرز کا اسلحہ فراہم ہوتا تھا۔ اس لئے فسادات میں اکثر فلسطینی عوام کی جان و مال کا بہت زیادہ نقصان ہوتا تھا۔

مجید حلبی فلسطینی دہشت گردوں کی ایک خفیہ تنظیم کے سربراہ تھے۔ ایک فساد کے دوران حیفہ میں ان کے ساتھیوں نے ایک یہودی قالین فروش کی دوکان جلادی۔ پولس نے ۱۹۳۸ء میں مجید حلبی کو گرفتار کیا لیکن ان کے خلاف پولس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لئے انھیں اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ حیفہ چھوڑ دیں۔ مجید حلبی نے حیفہ چھوڑا تو ان کی ملاقات یاسر البرّہ سے ہوئی۔ یاسر بھی ایک خفیہ تنظیم کا لیڈر تھا۔ وہ برّہ قصبہ کا رہنے والا تھا جو رملہ اور بیت المقدس کے درمیان واقع ہے۔ یاسر زیادہ پڑھا لکھا شخص نہیں تھا لیکن اس میں بے پناہ تنظیمی صلاحیت تھی۔ مجید حلبی اور یاسر البرّہ نے متحدہ طور پر کام شروع کیا۔ ایک دن اسلحہ اسمگل کرنے کے لئے دونوں اپنے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ ایک خفیہ ساحلی مقام پر بذریعہ موٹر بوٹ پہنچے۔ اسلحہ تو مل گیا لیکن اسی وقت برطانوی گشتی دستے نے ان پر فائرنگ شروع کردی۔ یاسر البرّہ نے اپنے تمام ساتھیوں بشمول مجید حلبی کو اسلحہ کے ساتھ وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور خود تنِ تنہا برطانوی سپاہیوں کو روکے رکھا۔ بالآخر شہید ہوگیا۔ اس مہم سے قبل اس نے ایک خط مجید حلبی کے نام لکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی تھی کہ مہم کے اختتام پر اسے مجید حلبی کے حوالے کرنا۔ اس جذباتی خط میں یاسر البرّہ نے لکھا تھا کہ اگر وہ اس مہم میں مارا جائے تو مجید حلبی اپنی سرگرمی اور تیز کردیں کیونکہ فلسطین سے یہودیوں کے ناپاک وجود کو پاک کرنے کے لئے بہت لمبی لڑائی لڑنی ہوگی۔ اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ جب مجید حلبی شادی کریں اور ان کے گھر بیٹا پیدا ہو تو اس کا نام یاسر رکھنا۔

مجید حلبی کو شادی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ان کی زندگی تو فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کے لئے وقف ہوچکی تھی۔ یاسر البرّہ کی موت کے بعد وہ بیت المقدس پہنچے اور اپنی تنظیم کی سرگرمیوں میں جٹ گئے۔ حکام کے شکنجے سے آزاد رہنے کے لئے مصلحتاً ایک اسکول میں مدرس ہوگئے۔ اسی اسکول میں رحمٰن بن عبدالرؤف عرفات القدوی الحسینی، جس کی عمر اس وقت ۹ برس کی تھی، طالب علم تھا۔ جب مجید حلبی نے اس لڑکے کو پہلی بار دیکھا تو ان کے منہ سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلا۔ "لعل یاسر"۔ تب سے رحمٰن بن عبدالرؤف پوری دنیا میں یاسر عرفات کے نام سے مشہور ہیں۔

مجید حلبی نے یاسر عرفات کی ابتدائی زندگی میں ان کی ذہنی نشوونما اور ان کے دل میں جذبۂ حریت کا شعلہ دہکانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب انہوں نے اپنی خفیہ تنظیم

''الآصفہ'' (طوفان) بنائی تو اس میں یاسر عرفات کو کیپٹن کا عہدہ دیا۔ اس وقت یاسر عرفات کی عمر ۱۲ سال تھی۔ افسوس مجید حلبی اپنے شاگرد کی رہنمائی کرنے کے لئے زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے۔ ایک گوریلا کارروائی کے سلسلے میں انھیں دمشق جانا پڑا جہاں سے وہ لوٹ کر نہیں آئے اور نہ ہی ان کی لاش ملی۔

پندرہ سال کی عمر میں یاسر عرفات غزہ میں فلسطین پارٹی کے صدر بنائے گئے۔ اب وہ دن رات پارٹی کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ اسکول جانا بھی بند کر دیا۔ اسی سبب والد سے بھی ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ پارٹی کے برگزیدہ رہنماؤں اور افرادِ خاندان کی نصیحت پر انہوں نے ۱۹۴۴ء میں تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔

۱۶ر مئی ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی قرارداد کی رو سے فلسطین کی تقسیم ہوئی اور اسرائیل کا قیام بحیثیت ایک علیحدہ یہودی مملکت عمل میں آیا۔ یاسر عرفات اس وقت بیت المقدس میں تھے جو قرارداد کی رو سے ایک بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا تھا اور جس کے نظم و نسق کی ذمہ داری اقوام متحدہ کو سونپی گئی تھی۔ لیکن اسرائیلی افواج نے قرارداد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیت المقدس پر دھاوا بول دیا۔ سینکڑوں فلسطینی مارے گئے اور ان کی املاک تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان حالات میں یاسر عرفات بیت المقدس سے غزہ منتقل ہوئے۔ بعد ازاں جولائی ۱۹۴۹ء میں افرادِ خاندان کے ساتھ قاہرہ چلے گئے۔ وہاں انھیں ٹیکنیکل اسکول میں داخل کیا گیا۔ اسی اسکول میں انہوں نے نشانہ بازی، بم بنانے اور گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی۔

۱۹۴۸ء کے اواخر میں فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی نے غزہ میں فلسطین کی جلاوطن حکومت قائم کی اور یاسر عرفات کے والد کو اس حکومت کے سکریٹریٹ میں ایک اہم عہدہ پر مامور کیا۔ یاسر عرفات قاہرہ سے غزہ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے اپنی تعلیم تو جاری رکھی لیکن اپنی خفیہ دہشت گرد تنظیم میں بھی سرگرم عمل رہے۔ کچھ عرصہ بعد یاسر عرفات اور مفتی اعظم کے مابین اختلافات پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں یاسر عرفات اپنے والد کے ایماء پر قاہرہ چلے گئے اور وہاں فواد کالج میں داخلہ لیا۔ ان دنوں مصر سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ شاہ فاروق کی ناکارہ حکومت کے خلاف مصر کے ہر مکتبِ فکر کے قائدین مظاہرے کر رہے تھے۔ فوجی عہدے دار بھی شاہ فاروق حکومت کا تختہ پلٹنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ یاسر عرفات نے بھی ان مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں فلسطین اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی اور مصری طلباء کے شانہ بشانہ

شہنشاہیت کے خلاف سرگرمِ عمل ہوگئے۔

۲۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو مصر میں فوجی بغاوت کامیاب ہوئی اور شاہ فاروق کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ جنرل نجیب کو ملک کا آئینی سربراہ اور کرنل جمال عبدالناصر کو وزیراعظم بنایا گیا۔ دوسال بعد (۱۹۵۴ء) میں ناصر نے نجیب کو اقتدار سے برطرف کردیا اور خود مصر کے مختارِ کل بن گئے۔

ناصر نے عرب نیشنلزم کی تحریک شروع کی اور تمام عرب علاقوں کو متحد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے اسرائیل کے خلاف بھی کئی بیانات دیئے۔ یاسر عرفات، ناصر کی سیاسی پالیسی سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے زبردست مداح بن گئے۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۶ء کو ناصر نے نہر سوئیز کو قومی ملکیت قرار دیا جس کے ردعمل میں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے متحدہ طور پر مصر پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں یاسر عرفات نے عملی طور پر حصہ لیا۔ انھیں کمانڈو دستہ کا نائب ناظم مقرر کیا گیا تھا۔ اس سات روزہ جنگ میں مصر کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ سینائی کے سارے علاقہ پر اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔ برطانوی اور فرانسیسی فوجی دستے پورٹ سعید اور پورٹ فواد پر قابض ہوگئے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں اقوامِ متحدہ کی مداخلت پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں برطانیہ اور فرانس نے مقبوضہ علاقے خالی کردیئے۔ اسرائیل نے سینائی کا علاقہ بتدریج خالی کرنے کا وعدہ کیا۔

اس جنگ کے بعد یاسر عرفات کے خیالات میں زبردست تبدیلی آئی۔ انھیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے مصر یا کسی دوسری عرب مملکت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ مصری فوج اور مصری قیادت پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا۔ انھوں نے طے کیا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے خود فلسطینیوں کو جدوجہد کرنی ہوگی۔

یاسر عرفات فلسطینی طلباء کا ایک وفد لے کر پراگ گئے جہاں طلباء کا بین الاقوامی کنونشن منعقد ہوا تھا۔ پراگ سے وہ جرمنی پہنچے۔ اس دوران انہوں نے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ جرمنی سے وہ کویت روانہ ہوئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک ملازمت کی پھر تعمیراتی ٹھیکہ داری کا کام شروع کیا۔ بہت جلد ان کی تجارت چل پڑی۔ کویت ہی میں انھوں نے صلاح خلف، خالد الحسن اور دوسرے فلسطینی رضاکاروں کے ساتھ مل کر ''الفتح'' تنظیم کی بنیاد رکھی۔

یاسر عرفات ۱۹۶۵ء تک کویت میں رہے۔ اس کے بعد ''الفتح'' نے اسرائیل کے خلاف دہشت گردی اور گوریلا جنگوں کا سلسلہ شروع کیا تو اسرائیل نے ان ممالک پر حملے شروع کئے جہاں ''الفتح'' کی شاخیں قائم تھیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر کئی عرب ممالک کے حکمرانوں نے یاسر

عرفات اور "الفتح" کی سرگرمیوں پر پابندی لگادی۔ ایک بار انھیں لبنان میں گرفتار کیا گیا۔ شام میں بھی انھیں دو مرتبہ گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں کو بری طرح شکست دی اور مصر، شام اور اردن کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ یاسر عرفات نے ان مقبوضہ علاقوں میں اپنی تنظیم آزادی کے خفیہ سیل قائم کئے اور "الفتح" کے رضا کاروں نے اسرائیلی مفادات کے خلاف دہشت گردی اور گوریلا کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے یاسر عرفات نے دہشت گردی کی پالیسی پر از سرِ نو غور کرنا شروع کیا۔ اب ان کے خیالات میں اعتدال آنے لگا تھا اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ڈپلومیسی اور مذاکرات کی حکمت عملی پر غور کرنے لگے تھے۔ جب ۱۹۸۲ء میں مصر۔ اسرائیل معاہدہ ہوا اور مصر نے اسرائیل کو بحیثیت مملکت تسلیم کرلیا تو مشرق وسطیٰ کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا۔ یاسر عرفات نے اسرائیل کے تعلق سے اپنا موقف فوری نہیں بدلا لیکن انھیں تیزی سے بدلتی ہوئی بین الاقوامی سیاست کا احساس تھا۔ وہ قیام فلسطین کے لئے اسرائیل سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے خود کو اور اپنی تنظیم کے دوسرے اراکین کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگے تھے۔

۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد دنیا بھر کے ممالک کو اپنی خارجہ اور داخلہ پالیسیوں میں تبدیلی کرنا پڑی۔ خلیجی جنگ کے بعد امریکہ براہ راست مشرق وسطیٰ کی سیاست میں ملوث ہوگیا۔ امریکہ کے دباؤ کی وجہ سے اسرائیل نے فلسطینی تنظیم آزادی سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے فی الحال فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں انتظامی اختیارات فلسطینی عوام کے حوالے کئے گئے۔ آج کل یاسر عرفات اس محدود اختیارات والی "مملکت" کے سربراہ ہیں۔ امن معاہدہ کی رو سے اسرائیل کو ان علاقوں سے بتدریج اپنی افواج ہٹانا چاہئے تھا جن پر وہ غیر قانونی طور سے قابض ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ یاسر عرفات ابھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ مقصد اسی دن پورا ہوگا جب ایک مکمل آزاد اور خود مختار فلسطین وجود میں آئے گا۔ تاہم یاسر عرفات کا شمار بیسویں صدی کے صفِ اول کے مجاہدینِ آزادی میں ہوتا ہے۔

تلمیح ۶۹ : حافظؔ شیرازی۔

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق

برو اے خواجہ عاقل ہنرے بہتر ازیں

(ص ۹۴ پر فیضؔ نے مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے جو حافظؔ شیرازی کا ہے)

شعر کا مطلب یہ ہوا کہ مجھ سے ناصح نے کہا غم کے سوا عشق میں اور کیا ہنر ہے تو میں نے اسے جواب دیا کہ اے عقل مند خواجہ اس سے بہتر ہنر اور کون سا ہے۔ حافظ شیرازی کے حالات کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۰

تلمیح ۷۰: مرزا غالبؔ

اس مجموعے کی پہلی نظم "دلِ من، مسافرِ من" (ص ص ۷ و ۸) کے اخیر کے مصرعے (چودھواں، پندرھواں، اٹھارواں اور انیسواں) غالبؔ کے ایک شعر کے الفاظ میں تھوڑی سے ردوبدل کر کے منظوم کئے گئے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

فیضؔ کے مصرعے ہیں۔

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے (چودھواں مصرعہ)
شب غم بری بلا ہے (پندرھواں مصرعہ)

....

ہمیں کیا برا تھا مرنا (اٹھارواں مصرعہ)
اگر ایک بار ہوتا (انیسواں مصرعہ)

غالبؔ کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱

تلمیح ۷۱: مخدوم محی الدین

فیضؔ اور مخدومؔ ترقی پسند تحریک کے دو اہم ستون تھے۔ فیضؔ نے مخدومؔ کی یاد میں دو غزلیں انہی کی زمینوں میں کہی ہیں۔ (ص ۱۳ تا ۱۶)۔ پہلی غزل کا مطلع ہے۔

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

مخدومؔ کی غزل کا مطلع ہے۔

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

دوسری غزل کے مطلع سے قبل فیض نے مخدوم کا ایک مصرعہ نقل کیا ہے ع

''اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب''

مخدوم کی اس غزل کا مطلع یہ ہے

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

مخدوم جن کا خاندانی نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خذری تھا ۴رفروری ۱۹۰۸ء کو ضلع میدک کے ایک گاؤں اندول میں پیدا ہوئے تھے۔ مولویوں، استادوں، قاریوں، خطاطوں اور مذہب پرستوں کے خاندان کا یہ سپوت اپنے وقت کے اہم ترین مارکسسٹوں میں سے ایک تھا۔ مخدوم کی شہرت جتنی ان کی شاعری کی مرہونِ منت ہے، ان کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ان کے سیاسی اور سماجی کارناموں میں پوشیدہ ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادبِ اردو میں کئی ایسے فنکاروں کو بامِ شہرت پہ پہنچایا جو برائے نام اشتمالیت یا ترقی پسند طرزِ زندگی کا دم بھرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر مراعات یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور مارکسسٹ اور ترقی پسند کہلائے جانے کے باوجود ایک آرام دہ اور عیش پسند زندگی گذارتے رہے۔ دراصل یہ نام نہاد ترقی پسند فنکار ایک فیوڈل معاشرے کے پروردہ تھے اور ستم ظریفی یہ کہ اشتمالیت کو بطور فیشن اپنانے کے باوجود انھوں نے اپنی فیوڈل قدروں کو بھی سینے سے لگائے رکھا۔

اردو کے ترقی پسند فنکاروں میں مخدوم ہی وہ واحد شخص تھے جن کے قول وفعل میں تفاوت نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اشتمالیت کو اپنی زندگی اور اپنے فن کے لئے مشعلِ راہ بنایا اور تاعمر اسی مشعل کی روشنی سے اکتساب کرتے رہے۔

مخدوم کی شاعرانہ عظمت ان کی نظموں سے ہے لیکن انہوں نے غزل گوئی میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا جادو جگایا ہے۔ مخدوم گو نظریاتی طور پر ایک کٹر مارکسسٹ تھے لیکن ان کی ذات میں چھپے ہوئے فنکار نے ان کے عقیدے کو فنی تقاضوں پر غالب نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اپنی شعری تخلیقات کو حتی الامکان نعرہ بازی سے بچائے رکھا اور اسی سبب وہ ایک بلند قامت شاعر ثابت ہوسکے۔

مخدوم کا انتقال ۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو دہلی میں ہوا اور تدفین حیدرآباد میں۔

تلمیح ۷۲: دکنی

فیض نے ایک دکنی غزل بھی کہی ہے (ص ۱۷) جس کی لفظیات برائے نام دکنی ہیں۔ اردو زبان کی بیشتر تواریخ میں ایک نظریہ کی تشہیر کی جاتی رہی اور آج بھی کی جاتی ہے کہ اردو کی جنم داتا دہلی اور اس کے نواح میں استعمال کی جانے والی بولی برج ہے۔ یہ نظریہ تاریخی اور منطقی ہر دو اعتبار سے مشکوک قرار پاتا ہے۔ بعض جید محققین نے، جن میں حافظ محمود خاں شیرانی اور جمیل جالبی قابل ذکر ہیں، اپنی ریسرچ سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ہند۔ اسلامی (ایرانی اور عرب) تہذیبوں کے اختلاط کے نتیجے میں ایک مخلوط بولی کی نشو ونما اسی وقت شروع ہو چکی تھی جب عربوں نے سندھ پر اپنا قبضہ جمایا تھا۔ اس کے بعد افغانی، مغل اور ایرانی حملہ آور درہ خیبر کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے۔ اس طرح سندھی، پنجابی، فارسی، پشتو، ترکی اور عربی زبانوں کے آپسی اختلاط نے ایک نئی بولی کو جنم دیا جو قواعد کے اعتبار سے ہندوستان کی پراکرت بھاشاؤں سے مماثلت رکھتی تھی لیکن اس کی لفظیات میں فارسی، ترکی اور عربی کے بے شمار الفاظ شامل تھے۔ جب دہلی پر مسلمان حکمرانوں کا قبضہ ہو گیا تو یہی مخلوط بولی سندھ اور پنجاب سے سفر کرتی ہوئی دہلی اور موجودہ اتر پردیش کے علاقوں میں داخل ہوئی۔ اس مرحلے پر دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں بولی جانے والی پراکرت بھاشا برج اس پر کافی اثر انداز ہوئی اور حکمرانوں اور رعایا میں آپسی بول چال کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا۔

تیرہویں صدی عیسوی کی شروعات (۱۲۰۶ء) میں محمد غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی جو ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی پہلی باضابطہ سلطنت تھی۔ اس طرح فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان قرار پائی لیکن ہندوستان کے جنوب۔ مغربی علاقوں میں عربی اور فارسی کی آمد اس سے کئی صدیوں پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اسلام سے قبل عرب تاجر کیرالہ، کرناٹک اور کوکن کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو چکے تھے۔ پھر جب عربوں نے ساسانی سلطنت کو شکست دے کر ۶۳۸ء میں ایران پر قبضہ کیا تو وہاں کے زرتشتیوں نے فرار ہو کر ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقوں میں پناہ لی اور اپنے ساتھ اپنی زبان پہلوی بھی لے آئے۔ اس طرح ہندوستان کے جنوب۔ مغربی علاقوں میں عربی اور ایرانی اثرات ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے بہت قبل مرتب ہو چکے تھے۔ یہ اثرات مسلم حملہ آوروں کی مہمات کا نتیجہ نہیں تھے کیونکہ علاء الدین خلجی سے قبل کسی مسلم حملہ آور نے وندھیاچل پہاڑی سلسلے کو سر کر کے دکن کے علاقے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ علاء الدین خلجی کی دکن میں آمد تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر کی بات ہے جبکہ عرب اور ایرانی

تاجر، صوفیاء، مبلغین، شعراء اور علماء اس واقعہ کے سینکڑوں برس قبل سے دکن میں آباد تھے۔ صوفیائے کرام اور درویش صفت مبلغین صدیوں تک امن وامان کے ماحول میں مقامی باشندوں میں اپنا پیغام پھیلاتے رہے۔ اس طرح دکن میں فارسی، عربی اور مقامی بھاشاؤں، مرہٹی، گجراتی، تیلیگو اور کنڑ کے اختلاط سے ایک نئی بول چال ظہور پذیر ہوئی جسے دکنی کہا گیا۔

فارسی اور دکن کے مقامی زبانوں کے اختلاط کو اس وقت مہمیز لگی جب محمد تغلق نے ۱۳۲۸ء میں اپنی حکومت کا پایہ تخت دہلی سے دیوگری (جو اورنگ آباد سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) منتقل کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ پایہ تخت کی منتقلی کے سبب امراء اور اہل علم وفن کثیر تعداد میں شمالی ہند سے آ کر دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ دولت آباد بہت جلد علم وثقافت کا مرکز بن گیا۔ دولت آباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر خلد آباد ایک پر فضا مقام ہے۔ ایک روایت کی رو سے ۱۴ سو صوفیائے کرام شمالی ہند اور بیرون ہند سے آ کر وہاں آباد ہوئے تھے۔ ان معنوں میں چودھویں صدی عیسوی کی شروعات سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال تک دولت آباد، اورنگ آباد اور خلد آباد نے ایک مشترکہ تہذیب اور زبان وادب کی نشو ونما اور آبیاری میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔

شمالی ہند سے ہجرت کر کے دکن میں آباد ہونے والے افراد اپنے ساتھ بول چال کی وہ مخلوط زبان بھی لے آئے جسے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں کئی ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ عربی، فارسی اور شمالی، مغربی ہند کی پراکرت بھاشاؤں کے اشتراک سے تشکیل پائی اس بولی کو کبھی ریختہ کہا گیا، کبھی ہندوی تو کبھی دہلوی۔ دکن پہنچ کر اس زبان کا اختلاط دکنی سے ہوا جو عربی، فارسی اور دکن کے بھاشاؤں کے اشتراک سے ظہور پذیر ہوئی تھی۔ شمالی ہند کی ریختی اور قدیم دکنی کے ملاپ سے دکنی زبان میں سلاست اور روانی پیدا ہوئی اور قواعد کی حد تک یہ ہندوستان کی کھڑی بولیوں (آریائی نژاد) کے زمرے میں شامل ہوگئی۔ یہ ہماری اردو کی خام اور اولین شکل تھی۔

شمالی ہند میں ریختہ کو بول چال کی حد تک تو استعمال کیا جاتا تھا لیکن اسے ادبی اور علمی زبان کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ اس کے برعکس دکنی بہت جلد تبلیغی، علمی اور ادبی مقاصد کے لئے استعمال کی جانے لگی۔ دکنی زبان کی اس ترقی میں صوفیائے کرام نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے مقامی باشندوں میں اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کے لئے دکنی کا استعمال کیا۔ اس لئے دکنی زبان کا اولین ادبی سرمایہ زیادہ تر مذہبی اور روحانی نوعیت کا ہے۔ کئی صوفیائے کرام مثلاً عین الدین گنج العلمؒ (متوفی ۷۹۵ھ)، خواجہ بندہ نوازؒ (متوفی ۸۲۵ھ)، شاہ میران جی شمسؒ العشاق (متوفی ۹۹۰ھ)، شاہ علی

محمد جیو گمد ھنی (متوفی ۲ ۹۷ ھ) اور شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ ھ) نے اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر دکنی زبان میں متعدد کتابچے لکھے جن میں زیادہ تر فارسی سے ترجمہ کیے گئے تھے۔ کئی محققین، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ (پیدائش ۳۰ر جولائی ۱۳۲۱ء، وفات: یکم نومبر ۱۴۲۶ء) کی تحریر کردہ کتاب ''معراج العاشقین'' کو دکنی نثر کی (اور اس طرح اردو نثر کی) پہلی کتاب مانتے ہیں۔

چونکہ شاعری بمقابلہ نثر عوام کے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اسلئے صوفیائے کرام نے اپنی تبلیغ کے لئے دکنی زبان میں کئی منظوم کتابچے بھی تصنیف کئے جن میں رسالہ 'کشف الاذکار' 'معراج نامہ' 'وجود نامہ' اور 'شفاعت نامہ' قابل ذکر ہیں۔ یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ جہاں دکنی نثر کے اوّلین نمونوں پر فارسی کا غلبہ نظر آتا ہے وہیں دکنی کی اوّلین شعری تخلیقات میں ہندوستانی بحور کا استعمال ہوا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم دکنی کے وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے عربی بحور اور فارسی کے شعری محاسن اپنی طویل نظموں میں استعمال کئے اور اس طرح دکنی شاعری میں مثنوی کی صنف کو رواج دیا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلاطین کی سرپرستی میں دکنی شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں مثنوی دکنی شعراء کی مرغوب ترین صنف تھی تاہم شروعات کی بیشتر دکنی مثنویاں فارسی داستانوں اور مثنویوں کا ترجمہ تھیں۔ گولکنڈہ کے ملا وجہی (متوفی ۱۶۵۹ء) پہلے دکنی شاعر تھے جنھوں نے اپنی مشہور زمانہ مثنوی ''قطب مشتری'' (سنِ تصنیف ۱۶۰۹ء) کے لئے خالص ہندوستانی اور یجنل موضوع کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مثنوی محمد قلی قطب شاہ اور ان کی محبوبہ مشتری کی داستانِ عشق ہے۔ یہ مشتری وہی ہے جو تاریخ میں بھاگ متی کے نام سے مشہور ہے۔ جب محمد قلی قطب شاہ نے اسے اپنے حرم میں داخل کیا تو اس کا نام مشتری رکھا اور حیدر محل کے خطاب سے نوازا۔ اسی خطاب کی مناسبت سے شہر حیدر آباد موسوم ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ (پیدائش: ۱۵۶۵ء، وفات ۱۶۱۱ء) والیٔ گولکنڈہ دکنی اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ انھوں نے پہلی بار دکنی اردو شاعری کو سیکولر خیالات و جذبات سے روشناس کروایا۔ ان کی غزلیں اور عشقیہ نظمیں، مناظر فطرت اور اپنے دور کی سماجی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی کئی نظمیں اس زمانے کی رسومات اور تہواروں کے متعلق ہیں۔ ابن نشاطی بھی قطب شاہی دور کے اہم شاعر ہیں۔ وہ گولکنڈہ کے باشندے اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۶۵۵ء میں احمد حسن زبیری کے ایک فارسی قصے ''بساتین'' کو دکنی اردو میں نظم کیا اور اس کا نام ''پھولبن'' رکھا۔

ایک ہزار سات سو چوالیس اشعار کی اس مثنوی میں ابن نشاطی نے کنچن پٹن بادشاہ کی کہانی پیش کی ہے۔ مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اس کا زورِ بیان ہے جسے پیدا کرنے کے لئے ابن نشاطی نے موزوں تشبیہات کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ ملا وجہی، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے ملک الشعراء تھے۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک باکمال نثر نگار بھی تھے اور ان کی نثر کی کتاب ''سب رس'' (سنِ تصنیف ۱۶۳۵ء) دکنی اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس سے قبل نثر کے جو نمونے ملتے ہیں ان کی نوعیت مذہبی ہے۔

محمد نصرت نصرتی (پیدائش ۱۶۰۰ء، وفات ۱۶۸۳ء) بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ ثانی کے دربار کے ملک الشعراء تھے۔ ''گلشنِ عشق'' (سنِ تصنیف ۱۶۵۷ء) 'علی نامہ' (سنِ تصنیف ۱۶۶۵ء) اور ''تاریخِ اسکندری'' (سنِ تصنیف ۱۶۷۲ء) ان کی مشہور مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ''گلشنِ عشق'' دکنی اردو میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے منوہر اور مد مالتی کی داستانِ عشق کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ دکنی اردو شاعری میں غواصی بھی ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی قطب شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی شہرت تین مثنویوں سے قائم ہے یعنی 'قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال' 'طوطی نامہ' اور 'مینا ستونتی'۔ بیجاپور کے ایک اور شاعر سید میراں ہاشمی بھی دکنی اردو شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ نصرتی کے ہم عصر تھے۔ ہاشمی مادرزاد اندھے تھے اور لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے لیکن ان کے اشعار میں مناظرِ فطرت کی تصاویر اپنے تمام جمال و دلکشی کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ہاشمی دکنی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دور کی خواتین کی مخصوص بول چال اور محاورے شاعری میں استعمال کئے۔ ان سے قبل کسی شاعر نے عورت کے دکھ درد، اسکے جذبات اور زندگی کو اتنی تفصیل سے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی تھی۔ اسی وجہ سے انھیں دکنی اردو کا پہلا ریختی گو شاعر کہا جاتا ہے۔ سلطنتِ بیجاپور کے آٹھویں فرمانروا علی عادل شاہ شاہی (پیدائش ۱۶۳۸ء، وفات ۱۶۷۲ء) دکنی اردو کے علاوہ ہندی اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ بیجاپور کے ایک اور قابلِ ذکر شاعر قاضی محمود بحری (متوفی ۱۷۱۷ء) ولی دکنی کے ہم عصر تھے۔ دکنی اردو دیوان کے علاوہ دو مثنویاں ''من لگن'' (سنِ تصنیف ۱۷۰۰ء) اور ''بنگاب نامہ'' (یعنی بھنگ کا پانی) ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ولی دکنی (پیدائش ۱۶۶۷ء، وفات ۱۷۰۷ء) اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور بیس برس تک تحصیل علوم کر کے احمد آباد گئے۔ دکنی اردو اور ترقی یافتہ اردو کی تاریخ میں ولی کی اہمیت مسلم ہے۔

انہوں نے شعرائے دہلی کو، جوان دنوں صرف فارسی میں شاعری کرتے تھے یہ درس دیا کہ اردو میں اعلیٰ شاعری کے امکانات موجود ہیں۔ ولؔی نے درحقیقت اردو شاعری میں ایک انقلاب لایا تھا۔ ان سے قبل مثنوی شعراء کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی۔ ولی نے غزل کو اپنا کر اسے اردو کی مقبول ترین صنف بنا دیا۔

دکنی زبان کی تاریخ کے اس سرسری خاکے سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جہاں تک علمی، ادبی اور مذہبی تصانیف کی ابتداء کا تعلق ہے تو دکنی زبان کو ریختہ، ہندوی یا دہلوی پر تقدم حاصل ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ جب ولؔی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو شمالی ہند کے فارسی گو شعراء نے اردو میں شاعری کی ابتدا کی اور یہ واقعہ اردو زبان وادب کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ کہا جا سکتا ہے۔

تلمیح ۷۳: شوپیں

(نظم ''شوپیں کا نغمہ بجتا ہے'' ص ص ۲۴ تا ۲۶)

پولینڈ کا مشہور شاعر میوزک کمپوزر اور پیانسٹ فریڈرک فرینکائے شوپیں (Frederic Francois Chopin) ۲۲ رفروری ۱۸۱۰ء کو زیلازووا۔ وولا (Zelazaowa-Wola) کے مقام پر پیدا ہوا جو وارسا (Warsaw) کے مضافات میں واقع ہے۔ اس کا باپ فرانسیسی نژاد تھا اور ماں پولش۔ شوپیں اپنے والدین کی تیسری اولاد تھا۔ اس نے موسیقی کی تعلیم ابتداء میں ایک چیک (Czech) موسیقار اڈلبرٹ زیوے (Adalbert Ziavey) سے حاصل کی جو جے۔ ایس۔ باخ (J.S. Bach) کا بہت بڑا مداح تھا۔ موسیقی کے علاوہ شوپیں نے بنیادی تعلیم وارسا کے تعلیمی ادارے لےسیئم (Lyceum) میں حاصل کی جہاں اس کا باپ فرانسیسی زبان کا پروفیسر تھا۔

موسیقی کی خداداد استعداد کی وجہ سے بہت جلد پولش سوسائٹی کے معزز افراد سے شوپیں کے مراسم قائم ہو گئے۔ اس اعلیٰ سوسائٹی کے آداب واقدار کا شوپیں کے دل ودماغ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ موسیقی کی باضابطہ تعلیم شوپین نے جوزف ایلسنر (Josheph Elsner) سے حاصل کی جو اپنے وقت میں وارسا کا سب سے بڑا موسیقار سمجھا جاتا تھا۔ انیس برس کی عمر میں شوپیں کو فنِ موسیقی پر مکمل قدرت حاصل ہو گئی چنانچہ ۱۸۲۹ء میں وہ ویانا (Vienna) منتقل ہوا۔ وہاں بطور پیانسٹ اس نے میوزیکل کمپوزیشن تخلیق کرنے شروع کیے۔ ۱۸۳۱ء میں شوپیں انگلستان کی سیاحت سے غرض سے ویانا سے روانہ ہوا لیکن جب وہ پیرس پہنچا تو اس نے اسی شہر کو اپنی مستقل رہائش گاہ بنا لیا۔ پیرس

کی اعلیٰ سوسائٹی میں بہت جلد شوپیں کی قدر و منزلت کی جانے لگی۔ یہاں اس کی دوستی مادام دودواں (Dudevant) سے ہوئی جو اپنے ادبی نام جارج سینڈ (George Sand) سے زیادہ مشہور تھی۔ وہ ایک قابل قدر ادیبہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر مرمٹے اور یہ عشق شوپیں کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ثابت ہوا۔

۱۹۳۸ء سے شوپیں کی صحت خراب رہنے لگی۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے مادام دودواں اسے اپنے ساتھ لیکر میجر کا، اسپین (Majorca, Spain) چلی گئی اور وہاں اتنی محبت اور لگن سے شوپیں کی عیادت اور خدمت کی کہ بہت جلد اس کی صحت سنبھل گئی۔ ۱۸۴۷ء میں دونوں کے تعلقات ختم ہو گئے اور اس سانحہ سے شوپیں بالکل ٹوٹ گیا۔ شوپیں کے پھیپھڑے خراب ہو چکے تھے۔ مادام دودواں سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا اور بالآخر ۱۷ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو پیرس میں اس کی وفات ہو گئی۔ شوپیں کی وفات کے بعد مادام دودواں سے اس کی محبت کو موضوع بنا کر کئی ناولیں، نظمیں اور گیت تخلیق کیے گئے۔ وفات سے ایک سال قبل شوپیں نے انگلستان کی سیاحت کی تھی جہاں اس کے مداحوں نے بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا تھا۔ شوپیں نے اپنی بہن کی گود میں دم توڑا جو اس کی بیماری کی خبر سن کر وارسا سے بھاگی بھاگی پیرس آئی تھی۔ اسے پیرس کے پیرے لشائی (Pere Lachaise) قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اس کے میوزیکل کمپوزیشن میں شوپیں کے نجی جذبات اور آلام کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ اسکا شمار بلا شبہ دنیا کے اعلیٰ ترین لیریکل کمپوزروں میں ہوتا ہے۔ پیانو بجانے میں بھی اسے اتنی ہی مہارت حاصل تھی جتنی میوزک کمپوزیشن میں۔ اسکے میوزیکل کمپوزیشن پہلی دفعہ ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئے تھے۔

تلمیح ۴۷: اخترؔ و داغؔ۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی (داغؔ)

(نظم "لاؤ تو قتل نامہ میرا" ص ۲۷ کے اخیر میں اخترؔ و داغؔ کا مندرجہ بالا شعر تضمین ہوا ہے)

کالیداس گپتا رضا کی تحقیق کے مطابق فیضؔ کی اس غزل نما نظم کے اخیر میں جو شعر تضمین ہوا ہے وہ درحقیقت والیٔ اودھ نواب واجد علی شاہ اخترؔ کے ایک شعر کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اخترؔ کا شعر ہے

لاؤ میں اپنے قتل کا محضر تو دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ دفتر لگی ہوئی

واجد علی شاہ اختر ریاست اودھ کے آخری تاجدار تھے۔ وہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انھیں نااہل قرار دیتے ہوئے معزول کردیا اور سلطنت کا انتظام اپنے اختیار میں لے لیا۔ واجد علی شاہ کی شخصیت میں فنونِ لطیفہ کے لئے فطری رجحان تھا۔ انھیں حکومت کے معاملات کے بجائے شاعری، موسیقی، رہس اور ڈراما میں زیادہ دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کی تھیں۔

فیضؔ نے بدلی ہوئی صورت میں جو شعر تضمین کیا ہے وہ داغؔ سے منسوب ہے۔ مرزا خاں داغؔ ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس الدین خاں کے انتقال کے بعد داغؔ کی والدہ نے مرزا فخرو، ولی عہدِ بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا۔ اس طرح دس گیارہ برس کی عمر سے داغ کی تربیت لال قلعہ میں ہوئی۔ چودہ برس کی عمر میں ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ بسلسلۂ روزگار حیدر آباد پہنچے۔ نظامِ وقت میر محبوب علی خاں آصف نے ان کی بڑی پذیرائی کی اور اپنا استاد مقرر کیا۔ داغؔ کا شمار اردو کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ داغؔ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

تلمیح ۷۵: پیرس

(نظم "پیرس" ص ص ۴۳ و ۴۴)

۱۹۷۹ء میں پیرس میں اپنے قیام کے دوران فیضؔ نے یہ نظم اس مشہور زمانہ شہر کی مدح میں کہی تھی۔

پیرس فرانس کا دارالحکومت اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ پیرس خوبصورت باغات اور پرشکوہ تاریخی عمارات کا شہر ہے۔ اس کی بارونق شاہراہوں کے دونوں کناروں پر شاہِ بلوط کے درختوں کی قطاریں ہیں۔

عرصۂ دراز سے پیرس دنیا بھر میں فنون لطیفہ اور تعلیم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مصوری اور ادب کی کئی انقلابی تحریکیں پیرس ہی میں شروع ہوئیں اور بعد ازاں دوسرے ممالک میں رواج پائیں۔ پیرس کی آٹھ سو سالہ قدیم یونیورسٹی کا شمار دنیا کے عظیم ترین علمی مراکز میں ہوتا ہے۔

پیرس کی تاریخ دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ زمانۂ قدیم میں کیلٹی (Celtic) نسل کے پیرسی قبائل نے اس شہر کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ۵۲ ق۔م۔ میں رومی حملہ آوروں نے اس پر قبضہ جمایا اور اس کا نام لوتیتیا رکھا۔ اس کے بعد دریائے سین کے دونوں کناروں پر نئے نئے محلے آباد ہوتے گئے حتیٰ کہ ۳۰۰ء کے آس پاس ایک وسیع شہر وجود میں آیا اور اس کا نام پیرس قرار پایا۔

فرینکش سلطنت کے حکمراں، کلووس نے ۵۰۷ء میں پیرس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۹۸۷ء میں ہوئی کوپے فرانس کا فرمانروا بنا۔ اس کے دور میں پیرس کی آبادی اور اہمیت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ فلپ دوم جس نے فرانس پر ۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۳ء حکومت کی، فنون لطیفہ اور ادب کا دلدادہ تھا۔ اس کے دور میں پیرس ثقافت، سیاست اور تعلیم کا مرکز بن گیا تھا۔

نشاۃ ثانیہ کے دوران فرانسیسی بادشاہوں نے پیرس کی خوبصورتی میں مزید اضافے کیے۔ انھوں نے قدیم یونانی اور رومی طرز تعمیر کے نمونوں پر پیرس میں محلات، باغات اور شاہراہیں تعمیر کروائیں۔ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء تا ۱۷۹۹ء) کے دوران پیرس انقلابیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں نپولین بوناپارٹ نے پیرس میں کئی نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ شہر کو باغات سے آراستہ کیا اور شہریوں کے لئے کئی دوسری سہولتیں فراہم کیں۔ نپولین سوئم (دورِ حکومت ۱۸۵۲ء تا ۱۸۷۰ء) نے پیرس میں بینک، اسپتال، ریلوے اسٹیشن، تھیئٹر اور کشادہ سڑکیں تعمیر کروا کے شہر کو جدید طرزِ معاشرت کا نمونہ بنا دیا۔

فرینکو۔ پروشین جنگ (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۱ء) کے دوران جب پیرس پر پروشین حملہ آوروں کا قبضہ ہوگیا تو انھوں نے شہریوں کی غذا اور پانی کی فراہمی کے ذرائع منقطع کر دیے۔ ان کڑے وقتوں میں پیرس کے فاقہ زدہ شہریوں نے زندہ رہنے کے لئے کتوں، بلیوں اور چوہوں تک کو بطور غذا استعمال کیا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران جرمن فوجیوں نے پیرس پر بمباری کر کے شہر کے کئی علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جرمن حملہ آور دریائے مرنے تک پہنچ گئے تھے جو پیرس سے ۲۴ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت پیرس کے ٹیکسی ڈرائیوں نے اپنا ایک دستہ بنا کر جرمن حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس کی وجہ سے جرمن فوج پیرس پر قابض نہ ہو سکی۔ البتہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے دوران جرمن فوج پیرس کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جرمن حملہ آوروں نے جون ۱۹۴۰ء میں فرانسیسی فوجیوں کو پسپا کر کے پیرس پر قبضہ کیا۔ پیرس کو مکمل تباہی سے

بچانے کے لئے حکومتِ فرانس نے اسے ایک "کھلا شہر" بنائے جانے کا اعلان کیا یعنی ایک ایسا شہر جس میں جرمن فوج کسی مدافعت کا سامنا کئے بغیر داخل ہو سکتی تھی۔ جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانس میں خفیہ مدافعتی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک کا مرکز بھی پیرس ہی تھا۔ اگست ۱۹۴۴ء میں اتحادی فوجوں نے پیرس کو جرمن فوج کے قبضے سے آزاد کرایا۔

پیرس کو دنیا کا خوبصورت ترین اور صاف ستھرا شہر بنانے کے لئے ۱۹۶۰ء میں حکومتِ فرانس نے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ پچھلے ۴۰ برسوں سے اس منصوبے پر عملی اقدامات کا سلسلہ جاری ہے ایک تخمینہ کے مطابق پیرس کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔

تلمیح ۷۶ : فلسطین۔

"مرے دل مرے مسافر" کی بیشتر نظمیں ہجری شاعری کے زمرے میں آتی ہیں جب فیضؔ پاکستان سے باہر یورپ یا بیروت میں مقیم رہے۔ اس مجموعے میں فلسطین سے متعلق دو نظمیں بھی شامل ہیں۔ "فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" (ص ص ۵۰ و ۵۱) اور "فلسطینی بچے کے لئے لوری" (ص ص ۵۲ تا ۵۴)۔ فلسطین کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۵۰

تلمیح ۷۷ : حافظؔ

(غزل 'نذر حافظ' ص ۵۵ و ۵۶)

حافظ کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۰۔

تلمیح ۷۸ : منصور اور فرہاد۔

پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی ، رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے ، فرہاد ہوئے

(غزل ص ص ۶۱ و ۶۲ کا دوسرا شعر)

منصور کے لئے دیکھئے تلمیح نمبر ۱۱ اور فرہاد کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۱۷

تلمیح ۷۹ : یوسف، یعقوب، کنعاں اور مصر۔

فیضؔ نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوبؑ جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

یوسفؑ اور یعقوبؑ کے لئے تو دیکھئے تلمیح نمبر ۱۵ زمانہ قدیم میں فلسطین کو کنعاں کہا جاتا تھا اس لئے اس تلمیح کی تشریح کے لئے تلمیح نمبر ۱۵ کے ساتھ تلمیح نمبر ۵۰ بھی دیکھئے۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا وطن گو کنعاں تھا لیکن ان کا تعلق مصر سے بھی رہا ہے۔ اس لئے مصر کی تاریخ کا سرسری جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

مصر دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ تقریباً پانچ ہزار قبل شمال مشرقی افریقہ کی وادیٔ نیل میں ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب وجود میں آئی اور آئندہ دو ہزار برسوں تک اس تہذیب کی شان شوکت برقرار رہی۔

دریائے نیل قدیم مصر کا روحِ رواں تھا اور اسی دریا کے اطراف واکناف قدیم مصری تہذیب نے جنم لیا۔ ہر سال نیل میں طغیانی آتی اور پانی کے بہاؤ کیساتھ کالی اور زرخیز مٹی دور دراز علاقوں سے بہتی ہوئی آتی۔ اس طرح نیل کے دونوں کناروں پر اس زرخیز مٹی کی تہیں جم جاتیں۔ اس مٹی میں قدیم مصری باشندے کاشتکاری کرتے اور کافی خوشحال زندگی بسر کرتے۔ قدیم مصری لوگ اپنے ملک کو کیمیت (Kemet) کہتے تھے جس کے معنی ہیں کالی زمین۔ کاشتکاری میں مدد دینے کے علاوہ دریائے نیل قدیم مصریوں کے لئے نقل وحرکت اور تجارت کا ایک اہم بحری راستہ بھی تھا۔ قدیم مصری تہذیب میں دریائے نیل کی مرکزی اہمیت کے سبب یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے مصر کو "تحفۂ نیل" لکھا ہے۔

انسانی تہذیب کی نشوونما میں قدیم مصریوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انہوں نے دنیا کی پہلی قومی حکومت تشکیل کی، علم الحساب کے بنیادی قاعدے ایجاد کئے اور ۳۶۵ دنوں پر مشتمل سالانہ کیلنڈر بنایا جو تا حال پوری دنیا میں رائج ہے۔ انھوں نے تصویری حروف کا ایک رسم الخط ایجاد کیا جسے ہیروگلیفکس (Heiroglyphics) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے نرسل (Papyrus) کی ڈنڈیوں کے گودے سے کاغذ بنانے کا فن بھی ایجاد کیا۔

قدیم مصر کے مذہب کا شمار دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے جس میں حیات بعد الممات کا نظریہ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ قدیم مصریوں نے کئی عظیم الشان شہر تعمیر کئے جن کے آثار آج تک ملک میں موجود ہیں۔ تعمیرات کے ضمن میں مصر اپنے اہراموں کے لئے مشہور ہے۔ یہ اہرام دراصل مصری فرمانرواؤں کے مقابر ہیں۔ قدیم مصری فرمانرواؤں کا لقب فرعون ہوتا تھا اور ان کی حیثیت دنیوی فرمانروا کے علاوہ روحانی پیشوا یا دیوتا کی بھی ہوتی تھی۔ مشہور ترین اہرام شہر غزہ

میں واقع ہیں۔

مصر کی قدیم ترین تہذیب کے آثار ان گاؤں میں نظر آتے ہیں جو پانچ ہزار سال قبل آباد ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گاؤں دو ریاستوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک ریاست ان گاؤں پر مشتمل تھی جو دریائے نیل کے دہانے کے قرب و جوار میں واقع تھے۔ دوسری ریاست جنوب میں واقع گاؤں پر مشتمل تھی۔ دہانے کے قریب کی ریاست نشیبی مصر کے نام سے موسوم تھی اور دہانے کے جنوب کی ریاست بالائی مصر کہلاتی تھی۔

تقریباً تین ہزار ایک سو برس قبل بالائی مصر کے فرمانروا مینس (Menes) نے نشیبی مصر کو شکست دے کر دونوں ریاستوں کو متحد کر دیا اور اس طرح دنیا کی پہلی قومی حکومت تشکیل پائی۔ شاہ مینس نے موجودہ شہر قاہرہ کے قریب ممفس (Memphis) شہر کی داغ بیل ڈال کر اسے مصر کا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد تیس سے زائد سلطنتوں نے مصر پر حکمرانی کی۔

قدیم ترین مصر پر سلطنتِ اوّل اور سلطنتِ دوّم کے فرمانرواؤں کی حکومت رہی جنہوں نے تقریباً چار سو برس تک اپنا اقتدار جمائے رکھا۔ مصر کی تیسری سلطنت کی ابتداء ۲۶۸۶ ق۔م۔ میں ہوئی۔ اس وقت تک مصر میں ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اگلے پانچ سو برسوں کے دوران مشہورِ زمانہ اہراموں کی تعمیر کا کام جاری رہا اسی لئے اس دور کو دورِ اہرام بھی کہا جاتا ہے۔

مصر کا سب سے پہلا اہرام ۲۶۵۰ ق۔م۔ میں شاہ زوسر (Zoser) کے مقبرہ کے بطور سقر (Saqqarah) میں تعمیر ہوا تھا۔ چوتھی سلطنت کے دوران اہرامِ عظیم اور دوسرے اہراموں کی تعمیر کا کام مکمل ہوا جو شہر غزہ میں واقع ہیں۔ اہرامِ عظیم شاہ خوفو (Khufu) کا مقبرہ ہے۔

پانچویں سلطنت کے دوران اقتدار پر سے بادشاہ کی گرفت کمزور ہونی شروع ہوئی کیونکہ اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں اور سرکاری افسروں کے مابین اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو چکی تھی۔ قدیم ترین سلطنتوں کا اختتام ۲۱۸۱ ق۔م۔ میں چھٹی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہوا۔ آئندہ پانچ سلطنتوں کے فرمانرواؤں کا اقتدار برائے نام تھا۔ اس دوران شہر تھیبس (Thebes) مصر کا دارالحکومت تھا۔

جب بارہویں سلطنت وجود میں آئی تو قدیم مصر میں وسطی سلطنتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلطنت کا قیام ۱۹۹۱ ق۔م۔ میں اس وقت ہوا جب جنوبی مصر کا ایک وزیر امین احت (Amenemhet) مصر کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے شہر اتجوی (Itjawy) کو

اپنا دارالحکومت بنایا۔ امین امحت اور اس کے جانشینوں نے پھر ایک دفعہ مصر کو اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت واپس دلائی۔ اس سلطنت کے دوران مصر کے فرمانرواؤں نے نوبیا (Nubia) فتح کر کے فلسطین اور شام کے ساتھ تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ تعمیرات، ادب اور دوسرے فنون نے اس دور میں کافی ترقی کی۔ وسطی سلطنت کا خاتمہ ۱۷۸۶ ق۔م۔ میں ہوا۔

قدیم مصر کی نئی سلطنتوں کا دور پانچ سو برسوں تک قائم رہا جس کے دوران مصر دنیا کا طاقتور ترین ملک بن گیا تھا۔ نئی سلطنتوں کی ابتدا ۱۵۵۲ ق۔م۔ میں ہوئی جب مصر کی اٹھارویں سلطنت وجود میں آئی۔ اس دور میں مصر ایک بہت بڑی شہنشاہیت کا روپ اختیار کر چکا تھا اور ۱۴۰۰ ق۔م میں جب شاہ تھموس سوم (Thutmose III) مصر کا فرمانروا تھا تو قدیم مصر ترقی کی معراج پر تھا۔ ۱۳۶۷ ق۔م میں امین ہوتپ چہارم (Amenhotep IV) مصر کا بادشاہ بنا۔ اس نے اپنے دور کے مروّجہ مذہبی اعتقادات میں کافی ردوبدل کیا۔ اس نے سورج کی پرستش کو مقدم ترین عبادت کا درجہ دیا جسے وہ اتن دیوتا (Aton god) کہا کرتا تھا۔ اس کی مذہبی اصلاحات کی تحریک کو مورخین انقلاب امرنا (Amerna Revolution) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تاہم اس کے جانشینوں نے پھر سے مصر کے پرانے مذہب کا احیاء کیا مثلاً طوطن خیمن (Tutunkeamen) نے سورج دیوتا کی پرستش کے ساتھ ساتھ دوسرے دیوی دیوتاؤں کی عبادت کو جائز قرار دیا۔

بیسویں سلطنت کے دوران قدیم مصر کی طاقت انحطاط پذیر ہوئی۔ مصر کو اپنے کئی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور کئی بیرونی طاقتوں نے مصر پر حملے شروع کئے۔ جب ۱۰۷۰ ق۔م میں بیسویں سلطنت کا اختتام ہوا تو مصر بہت کمزور ملک ہو چکا تھا۔ آئندہ سات سو برسوں میں تقریباً دس سلطنتوں نے مصر پر حکمرانی کی لیکن ان میں زیادہ تر غیر مصری حکمرانوں کی سلطنتیں تھیں۔ ۳۳۲ ق۔م میں مقدونیہ کے شہنشاہ سکندر اعظم نے مصر کو فتح کیا اور اسی برس شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ ۳۲۳ ق۔م میں سکندر کا انتقال ہوا اور اس کے ایک سپہ سالار طولیمی (Ptolemy) نے مصر پر اپنا قبضہ جمایا۔ اس طرح ۳۰۵ ق۔م میں طولیمی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ شروع میں اس سلطنت کے فرمانرواؤں نے مصر میں یونانی تہذیب کو فروغ دیا لیکن بعدازاں مصر کے قدیم مذہب کو بھی پنپنے کے مواقع دیئے اور دیوی دیوتاؤں کے منادر تعمیر کروائے۔ اس دوران مصر میں تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں اسکندریہ مصر کا دارالحکومت تھا۔

۳۷ ق۔م میں طولیمی سلطنت کی ملکہ قلوپطرہ ہفتم (Cleopatra VII) نے روم کے

ساجھی شہنشاہ مارک انٹونی سے شادی کی۔انٹونی قلمرو روم کا واحد خودمختار حاکم بننا چاہتا تھا۔اس نے اپنی اور قلوپطرہ کی افواج کو یکجا کر کے روم کے دوسرے ساجھی حکمران آکٹیوین(Octavian) کے خلاف جنگ کی لیکن انٹونی اور قلوپطرہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں نے خودکشی کر لی۔اس کے بعد مصر قلمرو روم کا حصہ بن گیا۔ ۳۹۵ء کے بعد مصر میں رومن ایمپائر کا زوال شروع ہوا اور ۶۴۲ء میں مسلمانوں نے مصر کو فتح کر لیا۔

۶۲۹ء میں شام کے مسلمانوں نے مصر پر حملہ کیا۔اس وقت مصر بزنطینی(Byazentine) یا مشرقی رومی قلمرو کا ایک حصہ تھا۔مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کے دارالحکومت اسکندریہ کو فتح کیا۔ مسلمانوں کے سپہ سالار عمرو بن العاص نے اپنے لشکر کے قیام کے لئے جو مقام منتخب کیا تھا وہیں آج کا شہر قاہرہ آباد ہے۔مسلمانوں کی آمد کے بعد مصری معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں ہونا شروع ہوئیں۔آہستہ آہستہ مصریوں نے عربی زبان اپنا لی اور عیسائیت چھوڑ کر حلقۂ اسلام میں شامل ہو گئے۔اس کے بعد مصر مملکتِ اسلامیہ کا ایک اہم صوبہ قرار پایا۔امیہ خلفاء کے زمانے میں دمشق مملکتِ اسلامیہ کا دارالخلافہ تھا اور جب عباسیوں نے اقتدار سنبھالا تو بغداد دارالخلافہ قرار پایا۔لیکن نویں صدی عیسوی کے وسط سے عباسیوں کی خلافت زوال پذیر ہونی شروع ہوئی۔ ۸۶۸ء تا ۹۶۹ء کے دوران ترکی کی دو سلطنتوں۔طولوند(Tulunid) اور اخشدید(Ikhshadid) نے مصر پر حکمرانی کی۔

جب فاطمی خلافت کو عروج حاصل ہوا تو شمالی افریقہ کے کئی ممالک پر اس کا قبضہ ہو گیا اور فاطمیوں نے ۹۶۹ء میں مصر کو فتح کر کے اسے اپنی خلافت کا مرکز بنایا۔فاطمیوں نے شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی اور ۹۷۳ء میں اسے دارالخلافہ قرار دیا۔انہوں نے مسجد الازہر اور اس سے ملحقہ جامعہ ازہر بھی تعمیر کی جو دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے اور عرصہ دراز سے اسلامی تعلیمات کا اہم ترین مرکز بنی ہوئی ہے۔

بارہویں صدی کے وسط سے فاطمیوں کی طاقت کمزور ہونی شروع ہوئی۔اس کی دو وجوہات تھیں۔پہلی تو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی آپسی چپقلش اور دوسری صلیبی جنگیں۔ ۱۱۶۸ء میں فاطمی خلیفہ نے حکومتِ شام سے درخواست کی کہ عیسائی افواج سے جہاد کرنے کے لئے اپنی فوج روانہ کرے۔شامی فوج کے ایک جانباز سپہ سالار صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو شکست فاش دی اور انھیں مصر کی سلطنتوں کے باہر دھکیل دیا۔اس کے بعد ۱۱۷۱ء میں صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلافت

کا خاتمہ کر کے مصر کو ایک آزاد مملکت کا درجہ دیا اور ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ صلاح الدین ایوبی کے دورِ حکومت میں امن و امان کی بحالی کے ساتھ ساتھ مصر میں ایک ترقی یافتہ نظام حکومت قائم ہوا۔ صلاح الدین ایوبی کے جانشینوں نے خلافتِ ایوبی کی داغ بیل ڈالی جو مصر میں ۱۲۵۰ء تک قائم رہی۔

۱۲۵۰ء میں ترکی نژاد مملوکیوں نے بغاوت کر کے مصر میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ مملوکی دراصل ایوبی خلفاء کی فوج میں شامل تھے اور ان میں سے اکثر خلیفہ کے ذاتی محافظین بھی تھے۔ مملوکیوں کا قائد بیبرس (Baybars) ایک عقل مند اور بہادر فوجی کمانڈر تھا۔ اس نے مصر کا اقتدار سنبھالا اور منگولوں کو ۱۲۶۰ء میں عین جلوت (فلسطین کا ایک علاقہ) کے مقام پر شکستِ فاش دی۔ آئندہ دو سو برسوں تک مصر پر مملوکیوں کی حکومت رہی اور اس عرصہ میں مصر کے مختلف فنون بشمول تعمیرات اور ادب نے کافی ترقی کی۔

۱۵۱۷ء میں مصر پر سے مملوکیوں کا اقتدار ختم ہوا کیونکہ اس سال ترک نژاد عثمانی خلیفہ سلطان سلیم نے مصر پر اپنا قبضہ جمایا۔ تاہم اس کے بعد بھی مملوکی افراد بے (گورنر) کی حیثیت سے ملک کے انتظامیہ میں شامل رہے۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ نے مملوکی اور عثمانی افواج کو جنگِ اہرام میں شکست دی۔ وہ مصر کو فرانس کی نو آبادی بنانا چاہتا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں نپولین نے اپنی فوج کے ایک کمانڈر کے ہاتھوں میں مصر کا اقتدار سونپا اور خود یورپ لوٹ گیا۔ عثمانیوں نے برطانیہ کے تعاون سے ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی فوجوں کو مصر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

ترکی نے عثمانی فوج کے ایک کمانڈر محمد علی کو مصر سے فرانسیسیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جب اسے اپنے مشن میں کامیابی ہوئی تو ۱۸۰۵ء میں وہ خود مصر کا حکمران بن بیٹھا۔ محمد علی ایک ذہین فوجی کمانڈر اور دور اندیش سیاسی قائد تھا۔ اس نے مصر کی فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کے لئے کئی ضروری اقدامات کئے۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ مصر میں اس کی حکومت صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب اس کی فوجی طاقت عثمانیوں کی فوجی طاقت سے برتر ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے فرانسیسی فوجی ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور مصری فوج کو فرانسیسی فوج کے سانچے میں ڈھالا۔ علاوہ ازیں محمد علی نے مصر میں مغربی طرزِ تعلیم رائج کی، زرعی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا اور صنعتی ترقی کے لئے کئی اقدامات کئے۔ لیکن محمد علی کے جانشین بہت کمزور ثابت ہوئے۔

محمد علی کا بیٹا سعید پاشاہ ۱۸۵۴ء میں مصر کا فرمانروا بنا اور ۱۸۶۳ء تک حکومت کی۔ سعید نے نہر سوئیز کی تعمیر کے کام کا ٹھیکہ ایک فرانسیسی کمپنی کو دیا۔ نہر کی تعمیر کا کام ۱۸۵۹ء میں شروع ہوا اور تکمیل ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔ ۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء سعید کا بھتیجہ اسماعیل مصر کا حکمران رہا۔ اسماعیل کی فضول خرچی کی وجہ سے مصر کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتحال کے پیش نظر اسماعیل نے نہر سوئیز کے جزوی حقوقِ ملکیت ۱۸۷۵ء میں برطانوی حکومت کو دیئے۔ اس طرح برطانیہ نہر سوئیز سے ہونے والی آمدنی میں سب سے بڑا حصہ دار ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ مصر کے انتظامیہ میں بھی برطانوی افراد نے مداخلت شروع کی۔ جب اسماعیل نے اس کی روک تھام کرنی چاہی تو برطانیہ نے سازش کر کے اسے اقتدار سے بے دخل کر دیا اور اسکے بیٹے توفیق کو مصر کا حکمراں مقرر کیا۔ مصری معاملات میں برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اثر کے خلاف مصری فوج میں بے چینی پھیل گئی اور کرنل احمد عُربی نے مصر سے برطانوی افراد کو بے دخل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کی۔ اس کے ردعمل میں برطانوی فوج نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر دھاوا بول دیا اور مصری فوج کو جنگ طال الکبیر میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور عُربی کو جلاوطن کر کے پھر سے توفیق کا اقتدار بحال کیا۔ لیکن یہ اقتدار برائے نام تھا۔ اصل اختیارات برطانوی منتظمین کے ہاتھوں میں تھے۔ برطانوی سامراجیت کے خلاف پہلے مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ نے آواز بلند کی۔ بعد میں عوام بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور اس طرح مصری نیشنلزم کی ابتدا ہوئی۔

جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑی تو مصر سیاسی نقطہ نظر سے خلافتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ جب ترکی نے جرمنی سے مل کر اتحادی طاقتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو برطانیہ نے مصر کو اپنے سامراج کا محروس علاقہ (Protectorate) قرار دیا اور اپنے مفادات، خصوصاً نہر سوئیز کے دفاع کے لئے کثیر تعداد میں فوجیں تعینات کیں۔ جنگ کے اختتام پر مصر کو انتظامی اور سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے خلاف نفرت بڑھتی گئی۔ حریت پسند مصریوں نے سعد ذغلول کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ جب انگریزوں نے ذغلول کو گرفتار کر کے جلاوطن کیا تو مصریوں نے بغاوت کر دی۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مجبوراً ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے مصر کی آزادی کا اعلان کیا تاہم کئی اختیارات بشمول فوجیوں کی تعیناتی، اپنے قبضہ میں رکھے۔

۱۹۲۳ء میں مصر کا نیا آئین تدوین ہوا جس کی رو سے ملک میں آئینی بادشاہت کا قیام عمل میں آیا۔ مصری حکمرانوں کو اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے برطانوی منتظمین سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

اس رسہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۶ء میں مصر اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے مصر کو مکمل آزادی نصیب ہوئی لیکن نہر سوئیز پر برطانیہ کا قبضہ برقرار رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران نہر سوئیز پر قبضہ کرنے کی غرض سے اطالوی اور جرمن افواج نے مصر پر حملہ کیا۔ اتحادی طاقتوں کی افواج نے جنگ الامین میں اطالوی اور جرمن افواج کو شکست دی۔ دورانِ جنگ مصر میں کافی تباہ کاری ہوئی۔ قحط کی صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ ان تمام آلام و مصائب کے لئے مصری عوام برطانیہ کو ذمہ دار قرار دیتے تھے اور وہ ہر صورت میں ملک سے برطانوی عناصر کو بے دخل کرنا چاہتے تھے۔

جب ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو مصر اس ادارے کا اساسی رکن بن گیا۔ اسی برس مصر نے دوسرے عرب ممالک کے اشتراک میں عرب لیگ قائم کی۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے اراکین کی اکثریت نے یہودیوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت (اسرائیل) بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب اسرائیل وجود میں آیا تو مصر اور دوسرے عرب ممالک نے اس یہودی مملکت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس شکست کی وجہ سے مصری عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بادشاہ مصر کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں چند محب الوطن افسران (جو افسرانِ حر کے نام سے مشہور تھے) نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور شاہ فاروق کو جلاوطن کر دیا۔ اس فوجی بغاوت کے اہم ترین قائد جمال عبدالناصر تھے۔ افسرانِ حر نے ایک انقلابی کمانڈ کونسل تشکیل کی جس نے ستمبر ۱۹۵۲ء میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ فوج کے کمانڈر محمد نجیب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۵۳ء میں مصر کو ایک جمہوری ملک بنائے جانے کا اعلان کیا گیا اور محمد نجیب نے صدر اور وزیر اعظم دونوں عہدوں کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور جمال عبدالناصر کو نائب وزیر اعظم کا عہدہ دیا گیا۔ آئندہ دو برسوں تک محمد نجیب نے ناصر کو اقتدار میں حصہ دار بنائے رکھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں قائدین میں اختلافات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر مصر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں محمد نجیب صدارت کا عہدہ حاصل کرنے میں ناکام رہے اور اقتدار پر ناصر کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ ۱۸؍ جون ۱۹۵۶ء کو برطانیہ نے اپنی فوج کو نہر سوئیز کے علاقہ سے ہٹا لیا۔

جمال عبدالناصر نے مصر کی تعلیمی، اقتصادی اور زرعی ترقی کے لئے کئی اہم اقدامات کئے۔

انہوں نے سوئیز پر اسوان ہائی ڈیم (Aswan High Dam) کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے امریکہ اور برطانیہ سے مالی تعاون لینا چاہا۔ جب دونوں ممالک نے تعاون دینے سے انکار کر دیا تو ناصر نے نہر سوئیز کو قومیائے جانے کا اعلان کیا۔ انتقاماً برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی افواج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ گو اس جنگ میں مصر کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی لیکن جنگ کے بعد جمال عبدالناصر نہ صرف مصر کے بلکہ تمام عرب ممالک کے ہیرو بن گئے۔ ۱۹۵۸ء میں شام کے قائدین نے ناصر سے درخواست کی کہ مصر اور شام کو متحد کر کے ایک نئی مملکت تشکیل کی جائے۔ چنانچہ دونوں ممالک کے اتحاد سے متحدہ عرب جمہوریہ (United Arab Republic) کا قیام عمل میں آیا اور ناصر کو اس نئی مملکت کا صدر منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں شمالی یمن بھی اسی مملکت کا حصہ بن گیا۔ تاہم بہت جلد شام کے قائدین نے ناصر کی اقتصادی پالیسیوں کی مخالفت شروع کی اور ۱۹۶۱ء میں شام نے متحدہ عرب جمہوریہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ اسی برس ناصر نے شمالی یمن کو بھی UAR سے علیٰحدہ کر دیا تاہم سرکاری طور پر مصر کا نام متحدہ عرب جمہوریہ قائم رہا۔

۵ رجون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے مصر پر پھر ایک بار حملہ کیا۔ اس جنگ میں مصر کو بھاری ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس کی ہوائی فوج تقریباً برباد ہوگئی۔ چھ دنوں بعد جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو اسرائیل علاقۂ سینائی، نہر سوئیز کے مشرقی کنارے، غازہ پٹی اور گولان کی پہاڑیوں پر قابض ہو چکا تھا۔ اس جنگ نے تمام عرب ممالک کے حوصلے پست کر دیئے۔ ناصر نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا تاہم مصری عوام نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ عہدۂ صدارت پر قائم رہیں۔ ناصر اپنے انتقال (۱۹۷۰ء) تک مصر کے صدر رہے۔ ناصر کے بعد انور سادات مصر کے صدر مقرر ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پھر سے مصر کا نام Arab Republic of Egypt رکھا۔ ناصر کے دور میں مصر سوویت روس کے بہت قریب ہو چکا تھا۔ سادات نے اس پالیسی کو بدل کر امریکہ سے دوستی کی راہ استوار کی۔ وہ پہلے عرب قائد تھے جنہوں نے ۱۹۷۷ء میں اسرائیل کا سرکاری دورہ کیا اور اسرائیلی پارلیمان (Knesset) سے خطاب کیا۔ ۱۹۷۸ء میں سادات نے امریکی صدر جمی کارٹر کے ایماء پر اسرائیلی وزیراعظم کے ساتھ ایک امن معاہدہ کیا جسے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ (Camp David Accord) کہا جاتا ہے۔ اس سمجھوتے کے بعد مصر کو اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس مل گئے اور مصر نے اسرائیل کو بحیثیت ایک مملکت تسلیم کر لیا۔

مصر کے بنیاد پرست سیاست دانوں نے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں سادات کو قتل کر دیا۔ اس کے

بعد حسنی مبارک مصر کے صدر ہوئے۔ وہ آج تک سادات کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں۔

تلمیح ۸۰ : گیت

(ص ۱۷۰۷)

اس گیت میں کوئی تلمیح نہیں ہے لیکن اس کی لفظیات چونکانے والی ہیں۔ یہ فیضؔ کا عام ڈکشن نہیں ہے۔ اس میں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فیضؔ نے یہ گیت ایک ہندوستانی خاتون کی فرمائش پر لکھا تھا۔ سرفراز اقبال کے نام اپنے ایک خط میں فیضؔ لکھتے ہیں:

> ''کینیڈا میں ایک ہندوستانی خاتون نے کہا کہ آپ کی اردو ذرا مشکل ہے۔ ہماری ہندی زبان میں بھی کچھ لکھئے۔ میں نے کہا سوچیں گے۔ پھر میں نے پوچھا آپ کیا کرتی ہیں؟ کہنے لگیں، باتیں کرتی ہوں۔ یہ بات ہمیں بہت پسند آئی اور اگلے دن ہم نے یہ گیت لکھا۔''

خود فیضؔ اس گیت کو ہندی گیت کہتے تھے۔ چنانچہ بیروت سے چھیمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔:

> ''ہندی گیت کینیڈا میں ایک ہندوستانی لڑکی کی فرمائش پر لکھا تھا۔''
> (مطالعۂ فیض کینیڈا، امریکہ، ص ۵۰۹)

تلمیح ۸۱ : بیدلؔ ؎

ہر کجا رفتم غبارِ زندگی در پیش بود

یاراں ایں خاکِ پریشاں از کجا برداشتم

(فیض کا آٹھواں اور آخری مجموعہ ''غبارِ ایام'' بہت مختصر ہے۔ اسکے ص ۲ پر بیدلؔ کا مندرجہ بالا شعر نقل ہوا ہے)

ہندوستان کے فارسی شعراء میں بیدل ایک ممتاز اور اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں ان کے سنِ پیدائش اور مولد کے تعلق سے قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس ضمن میں محققین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ ان کے ایک عقیدت مند خوش گو، جو لمبے عرصہ تک بیدلؔ کے ساتھ رہے اور بعد میں جنھوں نے ان کے حالات بھی قلمبند کیے اس بات کی اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ بیدل دورِ شاہجہانی میں ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ ''انتخاب'' سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ اسی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بیدلؔ کا انتقال دورِ محمد شاہی میں ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں ہوا اور خوش گو نے ''میرزا بیدل از عالم رفت'' کہہ کر تاریخ وفات کی طرف اشارہ کیا جس سے یوم پنجشنبہ ماہِ صفر تاریخ نکلتی ہے۔ سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن کاکوی نے خوش گو کے ''سفینہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ''اسے (خوش گو) کو بیدلؔ سے بڑی عقیدت تھی۔ دن رات ان کی خدمت میں باریاب تھا۔ خود اپنے سفینہ میں لکھتا ہے کہ ہزار سے زیادہ بار بیدلؔ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ بیدل کی وفات کے وقت وہ دلی ہی میں تھا اور فاتحہ سوم میں شریک تھا۔ بقول خوش گو بیدل ماہ محرم ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں بیمار پڑے، بخار آیا، چار پانچ دن بخار رہا پھر اتر گیا۔ غسل کیا۔ غسل کے دوسرے دن ۳ر صفر چہار شنبہ کی شام حرارت پھر عود کر آئی۔ رات بھر بخار رہا۔ نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ، جن سے بیدلؔ کا یارانہ تھا رات بھر بیدلؔ کے ساتھ رہے۔ ان کا بیان ہے کہ کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی بے ہوشی طاری رہتی .... بہر حال یاس کی حالت طاری ہوتی رہی یہاں تک کہ صبح کو حال دگر گوں ہو گیا۔ بتاریخ چار صفر، روز پنجشنبہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) دن کے چھ بجے انتقال کیا اور اپنی ہی حویلی کے صحن میں اس قبر میں دفن ہوئے جو دس سال پہلے ہی سے اپنے لئے بنوا رکھی تھی۔'' (سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن کاکوی، تحقیقی مطالعے (حصہ اول)، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۶۵ء ص ص ۱۳۷ و ۱۳۸) مصحفی نے اپنے تذکرے ''عقدِ ثریا'' میں بیدلؔ کا سنِ وفات ۱۱۴۳ھ

(۱۷۳۰ء) لکھا ہے لیکن دوسرے محققین اسے غلط سمجھتے ہیں۔

خوش گو کے ماخذ سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ بیدلؔ اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے تھے لیکن دوسرے محققین مثلاً آزاد بلگرامی اور قاضی عبدالودود اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ آزاد بلگرامی نے ان کا مولد عظیم آباد قرار دیا ہے اور قاضی عبدالودود کے نزدیک بھی یہ درست ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بیدل بہار میں راج محل میں پیدا ہوئے تھے جسے اکبر نگر بھی کہا جاتا تھا۔ خوش گو نے بیدلؔ سے اپنے مولد کے تعلق سے اکبر نگر ہی سنا ہوگا اور بعد مدت جب ان کے حالات قلم بند کرنے کا وقت آیا تو حافظہ کی کمزوری نے نگر کو آباد سے بدل دیا اور اسی وجہ سے ان کا مولد اکبرآباد قرار دیا۔ (قاضی عبدالودود کا مضمون ''بیدل کا مولد'' مشمولہ ماہنامہ ''تحریک'' سلور جوبلی نمبر، دوسرا ایڈیشن، اکتوبر ۱۹۷۹ء)

بہر کیف بیدلؔ فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے ہم عصر شعرائے فارسی بلکہ بعد کے اردو شعراء کو بے حد متاثر کیا۔ ان سے متاثر ہونے والے اردو شعراء میں سب سے اہم نام غالبؔ کا ہے۔

غالب نے دو صورتوں میں بیدلؔ کا اثر قبول کیا تھا۔ اوّل، غالبؔ مزاجاً انتہائی خوددار بلکہ خود پسند تھے۔ حالی کی تصنیف کردہ ''یادگار غالبؔ'' کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالبؔ کسی بھی معنوں میں خود کو عام انسانوں کی صف میں شامل کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے حتیٰ کہ عام انسانوں کی طرح مرنا بھی انھیں ناگوار تھا۔ غالبؔ کی اس انا پسندی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ درباروں سے دور رہیں اور بادشاہوں اور امراء کی مدح میں قصائد نہ کہیں۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا اور طوعاً و کرہاً انھیں بھی قصیدہ نگاری کرنی پڑی۔ اسی سبب ان کے قصائد میں وہ آمد، جدّت اور بے ساختگی نہیں ہے جو ان کی غزلوں کی شان ہے۔ بیدلؔ بھی ایک خوددار اور انا پسند طبیعت کے مالک تھے اور اسی وجہ سے غالبؔ نے انھیں اپنا آئیڈیل قرار دیا تھا۔

دوّم، غالبؔ کو بیدلؔ کا شعری اسلوب بہت مرغوب تھا۔ بیدلؔ سادہ فہم اور عامیانہ طرزِ ادا سے گریز کرتے تھے اور یہ روّیہ بھی ان کی انا پسندی کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسرے شعراء کی طے کی ہوئی راہ پر چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ غالب نے بھی شروعات میں اپنے لئے یہی وتیرہ اختیار کیا اور اپنے اسلوب اور فکری میلانات کے سلسلے میں طرزِ بیدل کو اپنایا۔ اسی لئے ان کا ابتدائی کلام مشکل پسندی کا شکار نظر آتا ہے۔

بیدلؔ نے نثر اور نظم کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ نکاتِ بیدلؔ، رقعاتِ بیدلؔ، دیوان اور چہار عنصر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ نہ معلوم کتنا ذخیرہ اور ہوگا جو دستبردِ زمانہ سے ناپید ہوگیا گو مثنوی طورِ معرفت اور گلِ زرد کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ بیدلؔ انتہائی زود گو شاعر تھے۔ خوش گو کے ماخذ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی کلیات میں تقریباً ایک لاکھ اشعار شامل ہیں۔ بیدلؔ نے مثنوی، قصیدہ، غزل، ہزل، رباعی، غرض اپنے وقت کی ہر مروّجہ صنف پر طبع آزمائی کی۔ اپنی زندگی ہی میں بیدلؔ کو بہت شہرت نصیب ہوئی تھی اور آج بھی برصغیر اور یورپ کی لائبریریوں میں ان کے کلام کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اپنے وقت میں افغانستان اور ترکستان میں بھی بیدلؔ کی شاعری کا شہرہ تھا۔

تلمیح ۸۲: وید

تھا ویدوں پر وشواس بہت

(مجموعے کی پہلی نظم ''تم ہی کہو کیا کرنا ہے'' کا اٹھارواں مصرعہ، ص ۴)

سنسکرت لفظ وید کے لغوی معنی علم کے ہیں۔ مرادی معنوں میں اس کا اطلاق ہندو دھرم کے چار مقدس صحیفوں پر ہوتا ہے۔ یہ چار مقدس صحیفے۔ رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھرو وید کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر انھیں سامہتاس (مجموعے) بھی کہا جاتا ہے۔ چاروں وید قدیم سنسکرت میں لکھے گئے ہیں۔

ہندوستان میں داخل ہونے سے کئی برسوں قبل آریائی نسل کے لوگوں نے اپنی عبادت کے منتر اور مقدس گیتوں کی تخلیق شروع کی تھی۔ آریائی عقائد فطرت اور کائناتی مظاہرہ کی مدح سرائی سے عبارت ہیں۔ آریائی افراد کے اولین وید منتروں میں ایک ایسے کائناتی عقیدے کے نقوش نظر آتے ہیں جس میں اجداد کے تقدس، جنت اور زمین، ایک کائناتی مذہبی قانون اور اس قانون کو قائم و دائم رکھنے کی اساس یعنی ورونا کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کائناتی مذہب کے شانہ بہ شانہ آریائی لوگوں نے آگ کی پوجا کرنے کی رسم بھی اپنائی تھی۔ تاہم اس زمانے میں آریائی نسل کے لوگ مورتی پوجا کے حق میں نہیں تھے۔ آگ دیوتاؤں اور انسان میں تعلق پیدا کرنے کے لئے رابطہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

آریائی لوگوں کے ان منتروں اور مقدس گیتوں کی تالیف کا کام ۱۲۰۰ ق۔م میں شروع ہوا۔ ۱۲۰۰ ق.م. تا ۹۰۰ ق.م. رگ وید کی تالیف ہوتی رہی اور ۹۰۰ ق.م. تا ۵۰۰ ق.م. کے دوران بقیہ تین ویدوں یعنی یجر وید، سام وید اور اتھرو وید کی تالیف کا کام ہوتا رہا۔ اس طرح

ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ۵۰۰ ق.م. تک آریائی لوگوں نے اپنے مذہبی صحیفوں کی تالیف کا کام جاری رکھا۔

ہندو عقائد کے مطابق وید آفاقی اور الہامی صحائف ہیں اور تمام ہندو افراد انھیں مذہبی عقائد کے سلسلے میں حرف آخر سمجھتے ہیں۔ عہدِ وید (Vedic Age) کے اختتام پر ان صحائف کو منظوم مقدس گیتوں اور منتروں سے مرصع نثر میں ترجمہ کیا گیا جنھیں برہمناس اور ارانیکاس (صحائف دشت) کہا جاتا ہے۔ ویدوں میں مذکور نظریہ قربانی اور اساطیر کی از سرِ نو تشریح کائنات اور فرد کے باہمی رشتے کی روشنی میں کی گئی۔ اس سلسلے میں فلسفہ کے مختلف دبستانوں نے مختلف تشریحات پیش کیں جنھیں مجموعی طور پر اپنیشد کہا جاتا ہے۔ اس لئے جب ویدک لٹریچر یا ویدوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد چار ویدوں کے علاوہ صحائف دشت اور اپنیشد ہوتی ہے۔

تلمیح ۸۳: بیروت۔

(نظم "ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے" ص ص ۱۰ و ۱۱)

بیروت مملکت لبنان کا صدر مقام اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے جو بحر اوسط کے ساحل پر واقع ہے۔ ایک زمانے میں بیروت اپنی بندرگاہ کی وجہ سے مشہور تجارتی مرکز اور ۱۹۷۰ء کے اختتام تک مشرق وسطیٰ کا سب سے زیادہ خوبصورت اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۹۱ء کے دوران بیروت خانہ جنگی کا شکار رہا جس کی وجہ سے شہر تقریباً تباہ و برباد ہو گیا۔ فیض اپنی نظم میں جس کربلا کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ بیروت کی خانہ جنگی ہی ہے۔

بیروت میں مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ مشرقی بیروت کے اشرافیہ علاقہ میں زیادہ تر لبنانی عیسائی رہتے ہیں جبکہ سنی مسلمانوں کی اکثریت مغربی بیروت کے مصسطبہ علاقہ میں آباد ہے۔ شیعہ مسلمان اور فلسطینی مہاجروں کی اکثریت شہر کے جنوبی علاقوں میں رہتی ہیں۔ مذہبی، نسلی اور فرقہ وارانہ نفاق کی وجہ سے شہر میں اکثر تشدد کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بیروت ایک کوسموپولیٹن شہر ہے جس کی ثقافت پر عرب اور یورپی اثرات کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل سے بیروت عرب قومی نظریات کی ترویج کا اہم مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی وسطیٰ کا سب سے زیادہ لبرل شہر بن کر ابھرا۔ اپنے وسیع المشرب اور لبرل کردار کی وجہ سے یہ شہر عرصہ دراز سے عرب دانشوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ چونکہ بیروت کی آبادی کا ایک خاطر خواہ حصہ عیسائیوں پر

مشتمل ہے اس لئے مغربی ممالک کی کئی رضا کار تنظیمیں ان عیسائیوں کے مفادات کی حفاظت کی خاطر بیروت میں سرگرمِ عمل رہی ہیں۔ اسی مقصد سے ۱۸۶۶ء میں بیروت میں امریکی عیسائیوں نے سیرین پروٹسنٹ یونیورسٹی قائم کی تھی جو آج کل امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح ۱۸۸۱ء میں فرانس کے عیسائی مشن نے سینٹ جوزف یونیورسٹی (Universite' Saint Joseph) قائم کی۔ ان تعلیمی اداروں کے ذریعہ مشرق وسطیٰ میں مغربی افکار و خیالات کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی سے قبل بیروت کے شہری فخریہ طور پر اپنے شہر کو ''مشرقِ وسطیٰ کا پیرس'' کہا کرتے تھے۔ لیکن ساتویں دہائی کے وسط سے شہر کی ثقافتی اور تجارتی سرگرمیاں تقریباً ناپید ہوگئیں تاہم اکثر تعلیمی ادارے اب بھی علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں یونیورسٹیوں کے علاوہ بیروت میں لبنان یونیورسٹی (سنِ تاسیس ۱۹۵۱ء)، بیروت عرب یونیورسٹی (سنِ تاسیس ۱۹۶۰ء) اور حجازی یونیورسٹی کالج (سنِ تاسیس ۱۹۵۵ء) بھی اہم تعلیمی ادارے ہیں۔

بیروت ایک قدیم شہر ہے جس کا ذکر یہودیوں کے مقدس صحائف میں بھی ملتا ہے۔ چودھویں صدی قبل مسیح میں یہ قلمرو روم کی نو آبادی تھا اور اس وقت اس کا نام کولونیا جولیا آگسٹا فیلیکس بیری تس (Colonia Julia August Felix Berytus) تھا۔ اس وقت شہری آبادی اشرافیہ اور مصطبہ پہاڑوں کے درمیانی وادی میں آباد تھی۔ رومی عہد میں بیروت اپنے مدرسہ قانون کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا جو تین سو سال سے زائد عرصہ تک قائم رہا۔ رومیوں کا بسایا ہوا شہر زلزلوں کی نذر ہوگیا اور ۵۵۱ء میں اس قدیم شہر کے آثار تک باقی نہیں تھے۔ عربوں نے ۶۳۵ء میں بیروت فتح کیا لیکن پہلی صلیبی جنگ کے دوران یروشلم کے بادشاہ بالڈون اول (Baldwin I) نے ۱۱۱۰ء میں اس پر اپنا قبضہ جمایا۔ ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو شکست دے کر بیروت کو پھر سے مملکت اسلامیہ کا حصہ بنایا۔ ۱۵۱۶ء کے بعد سے بیروت خلافتِ عثمانیہ کا حصہ بن گیا اور یہ صورتحال پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک قائم رہی۔

۸ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اتحادی فوجیوں نے (جن کی قیادت برطانوی جنرل ایڈمن ہنری ہمن من النبی (Edmund Henry Hynmna Allenby) کر رہا تھا) عثمانی فوج کو شکست دے کر بیروت کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر لیگ آف نیشنز کے انتدابی نظام (Mandata System) کے تحت لبنان بشمول بیروت فرانس کے حوالے کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی منتظمین نے مملکتِ لبنان قائم کر کے بیروت کو اس کا صدر مقام قرار دیا۔ ۱۹۲۶ء

میں اسے ایک جمہوری مملکت بنایا گیا تاہم لبنان کو فرانسیسی سامراج سے مکمل آزادی ۱۹۴۶ء میں نصیب ہوئی۔ فرانسیسی فرمانروائی کے دوران بیروت کی ثقافت، تعمیرات، زبان اور افکار و نظریات پر مغربی اثرات مرتب ہوئے خصوصاً لبنانی عیسائیوں نے ان اثرات کو بہت زیادہ قبول کیا۔ فرانسیسیوں کے چلے جانے کے بعد بیروت میں تجارت، سیاحت، بینک کاری وغیرہ کو کافی ترقی ہوئی اور شہریوں کے معیارِ زندگی میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ قیامِ اسرائیل اور اس کے فوری بعد عرب۔ اسرائیل جنگ کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں فلسطینی مہاجرین بیروت میں آبسے۔

۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی کی وجہ سے بیروت کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ سنی، شیعہ، دریوز، فلسطینی اور عیسائی افراد نے شہر کے مختلف حصوں میں اپنا اپنا کنٹرول قائم کیا۔ شہر کا انتظامیہ بد سے بدتر ہوتا گیا اور بیروت ایک ترقی یافتہ شہر کے بجائے میدانِ کارزار بن گیا۔ تنظیم آزادی فلسطین (Palestine Libration Organisation) نے بیروت میں اپنے کیمپ قائم کئے۔ اس کے ردعمل میں ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کیا تاکہ فلسطینی مہاجرین کو بیروت چھوڑنے پر مجبور کیا جاسکے۔ اسرائیل کی مسلسل بمباری کی وجہ سے شہر کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور بالآخر مجاہدینِ فلسطین بیروت سے تیونس منتقل ہوئے۔ ۱۹۸۲ء کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی فوج، جس میں فرانسیسی، اطالوی، امریکی اور برطانوی فوجی شامل تھے، تعینات کی گئی۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ہوئے ایک بم دھماکہ میں تین سو سے زائد امریکی اور فرانسیسی فوجی ہلاک ہوئے جس کے بعد ۱۹۸۴ء کے اوائل میں بین الاقوامی فوج ہٹالی گئی۔ ۱۹۸۶ء میں لبنانی حکومت نے شامی حکومت سے درخواست کی کہ بیروت کی خانہ جنگی کو روکنے کیلئے اپنی فوج روانہ کرے۔ شامی فوج کی آمد کے بعد بھی بیروت میں تشدد اور فسادات کا سلسلہ جاری رہا تاہم ۱۹۹۰ء کے بعد سے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے اور آج کل بیروت کی تعمیر نو کے منصوبے تیار ہورہے ہیں۔

تلمیح ۸۴: لبنان ع

اور رُخشاں ہے ارضِ لبناں

(نظم "ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے" کا ساتواں مصرع ص ۱۰)

تلمیح بیروت میں لبنان کا ذکر آچکا ہے کیونکہ بیروت لبنان کا صدر مقام ہے۔ تاہم ارضِ لبنان کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۹۲۶ء میں تدوین کئے گئے آئین کی رو سے لبنان ایک جمہوری ملک ہے۔ اس آئین کی ترمیم سنہ ۱۹۹۰ء میں کی گئی جس کے بعد وزیراعظم کے اختیارات میں اضافہ ہوا۔ آئین کی رو سے صدارت کے عہدے پر ایک عیسائی اور وزیراعظم کے عہدے پر ایک سنی مسلمان ہی کا تقرر ہو سکتا ہے۔

ملک میں ایک پہاڑی سلسلہ ہے جسے عرف عام میں کوہِ لبنان کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس ملک کا نام لبنان پڑا۔ زمانۂ قدیم میں یہ فونیشیا کا حصہ تھا ۶۴ ق۔م۔ میں رومی شہنشاہ پومپئی نے فونیشیا فتح کیا اور لبنان کو اپنی قلمرو کا حصہ بنایا۔ رومی عہد میں لبنان شام کا ایک صوبہ تھا۔ جب رومیوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا تو لبنانی عوام بھی عیسائیت کے پیروکار بن گئے۔ عرب مسلمانوں نے سنہ ۶۳۰ء میں لبنان فتح کیا لیکن انہوں نے مقامی عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہنے کی اجازت دیدی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں دریوز (ایک غالی شیعہ فرقہ) مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے کوہِ لبنان کے جنوبی علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ سنہ ۱۰۹۹ء صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کے عیسائیوں نے لبنان پر قبضہ کیا اور تیرہویں صدی کے اختتام تک ملک کے زیادہ تر علاقہ پر ان کا قبضہ برقرار رہا۔ ۱۵۱۶ء میں لبنان خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا اور پہلی جنگِ عظیم کے اختتام تک اس علاقہ پر عثمانی خلفاء کا اقتدار برقرار رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے تاریخی واقعات تو وہی ہیں جن کا ذکر بیروت کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ بیروت نہ صرف لبنان کا صدر مقام ہے بلکہ ملک کی نصف سے زیادہ آبادی اسی شہر میں آباد ہے۔ اسلئے لبنان کے بحیثیت ایک مملکت قیام پذیر ہونے کے بعد یعنی ۱۹۲۰ء کے بعد اس ملک کی تاریخ دراصل بیروت کی تاریخ ہے۔

تلمیح ۸۵ : (سکندر) سکندر و دارا ؎

ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر

(نظم "ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے" کے پندرہویں، سولہویں اور سترہویں مصرعے، ص ۱۱)

سکندر اعظم نے جتنے علاقے فتح کئے تھے ان میں زیادہ تر قلمرو فارس کے علاقے شامل تھے

اور اس وقت دارا سوم شہنشاہ فارس تھا۔ اسلئے جب بھی سکندر کے ساتھ دارا کا نام استعمال ہوگا تو اس سے مراد دارا سوم ہوگی۔

مقدونیہ کا بادشاہ اور قلمرو فارس کا فاتح سکندر دنیا کے عظیم ترین معرکہ آراؤں میں سے ایک تھا۔ تاریخ میں اسے سکندر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سکندر ۳۵۶ ق۔م۔ میں مقدونیہ کے صدر مقام پلاّ (Pella) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ فلپ دوم مقدونیہ کا فرمانروا تھا اور اس کی ماں اولمپائس مملکتِ ایپرس (Epirus) کی شہزادی تھی۔ اس زمانے کا مشہور فلسفی ارسطو اس کا استاد تھا جس نے سکندر کو علم بلاغت، ادب، سائنس، طب اور فلسفہ کی مکمل اور جامع تعلیم دی تھی۔ ۳۳۶ ق۔م۔ میں فلپ دوم کا قتل ہوا جس کے بعد سکندر مقدونیہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اسے بہت جلد یہ احساس ہوگیا کہ نہ صرف بیرونی طاقتیں اس کی حکومت کے لئے خطرہ ہیں بلکہ اس کے دربار کے وزراء اور امراء بھی اس کی حکومت کا تختہ پلٹ سکتے ہیں۔ ایک قلیل مدت میں سکندر نے امور حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کی، درباری سازشیوں کا خاتمہ کیا اور پڑوسی ممالک کو اپنا باجگذار بنالیا۔ ۳۳۶ ق۔م۔ کے اواخر میں اس کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی اور یونان کی ۲۲ مملکتوں نے اسے اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا تھا۔

سکندر نے ۳۳۴ ق۔م۔ میں قلمرو فارس کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ۳۵ ہزار فوجیوں کی قیادت کرتے ہوئے اس نے شہر ٹرائے (Troy) کے قریب فارس کی فوج کو شکست دی۔ اس فتح کے بعد ایشیائے کوچک کی تمام سلطنتیں اس کی باجگذار بن گئیں۔ قلمرو فارس کی اصل فوج سے سکندر کا مقابلہ شام کے شمال۔ مغرب میں واقع ایک مقام آئسس (Issus) پر ہوا۔ ایرانی فوج کی کمانڈ خود شہنشاہ فارس دارا سوم (Darius III) کر رہا تھا۔ قدیم روایات کے مطابق دارا کی فوج پانچ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس جنگ کا اختتام ۳۳۳ ق۔م میں ہوا اور سکندر کو فتح حاصل ہوئی۔ شکست کے بعد دارا اپنی بیوی، بچوں اور ماں کو چھوڑ کر اپنی سلطنت کے شمالی علاقوں کی جانب فرار ہوا۔ اس کے بعد سکندر نے غازہ کو فتح کیا اور وہاں سے مصر میں داخل ہوا۔ مصر میں اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ عوام نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ بعد ازاں سکندر نے دریائے نیل کے دہانے کے قریب ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اسکندریہ نام دیا۔ یونانی قلمرو میں یہ شہر ادبی، سائنسی اور تجارتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔

سکندر نے شمال کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ طائر (Tyre) کے مقام پر اس نے

اپنی فوجوں کو دوبارہ منظم کیا۔ چالیس ہزار پیادہ سپاہیوں اور سات ہزار شہسواروں کے ساتھ اس نے دوبارہ دارا کی فوج کا سامنا کیا۔ دارا کی فوج میں حقیقتاً کتنے سپاہی شامل تھے اس بارے میں تاریخی شواہد ناپید ہیں۔ ایک مبالغہ آمیز تخمینہ کے مطابق دارا دس لاکھ سپاہیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ یکم اکتوبر ۳۳۱ ق۔م کو سکندر نے دارا کو پھر ایک بار شکست دی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہوا۔ بعد میں اس کی فوج کے دو سپہ سالاروں نے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح سکندر نے بابل فتح کیا اور قلمرو فارس کے صدر مقام پرسی پولس (Persepolis) کی جانب پیش قدمی کی۔ اس شہر پر قبضہ کرنے کے بعد سکندر نے اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اب تمام قلمرو فارس بشمول افغانستان اور بلوچستان پر سکندر کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ۳۲۶ ق۔م میں سکندر نے دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پر حملہ کیا اور راجہ پورس کو شکست دے کر دریائے بیاس کے مغربی کنارے تک پیش قدمی کی۔ وہ پورے برصغیر کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے سپہ سالاروں نے دریائے بیاس کے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً سکندر نے مقدونیہ لوٹنے کا فیصلہ کیا اور واپسی کیلئے بحری راستہ اختیار کیا۔ دریائے سندھ کے راستے وہ ستمبر ۳۲۵ ق۔م۔ میں بحیرۂ عرب تک پہنچا۔ پھر اس کا بحری لشکر خلیجِ فارس میں داخل ہوا۔ ایران کے ساحل پر پہنچ کر اس نے پھر بری راستہ اختیار کیا اور ۳۲۳ ق م کے اوائل میں بابل پہنچا۔ اسی سال ماہِ جون میں اس کا انتقال ہوا۔

سکندر دنیا کے عظیم ترین فاتحین میں سے ایک تھا۔ اپنی فوجی حکمتِ عملی کے برتے پر اس نے تین سال کے قلیل عرصہ میں قلمرو فارس کے وسیع و عریض علاقہ کو فتح کر لیا تھا۔ وہ جتنا بہادر تھا اتنا ہی ظالم و جابر بھی۔ تاریخی ماخذات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بلانوش شرابی تھا اور نشے کی حالت میں اس نے اپنے عزیز دوست کلائی ٹس (Clitus) کو بھی قتل کر دیا تھا۔ بطور ایک حاکم اور منتظم سلطنت سکندر نے کئی پرشکوہ منصوبے بنائے تھے۔ وہ دنیا کے تمام مشرقی اور مغربی ممالک فتح کر کے ایک عالمی ایمپائر قائم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی غرض سے سکندر نے کئی شہر آباد کئے۔ ان میں سے اکثر اسکندریہ نام ہی سے موسوم تھے۔ ان شہروں میں زیادہ تر یونانی سپاہی، تاجر اور علماء آباد ہوئے۔ اس طرح سابقہ قلمرو فارس کے وسیع علاقہ میں یونانی ثقافت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سکندر کے معرکوں کی وجہ سے یونانی زبان بھی ایشیائے کوچک، شمالی افریقہ اور وسطی ایشیاء میں بولی اور سمجھی جانے لگی۔

ادبی روایات میں فاتح، غازی، مجاہد یا معرکہ آرا شخص کو سکندر کے نام سے تشبیہ دی جاتی ہے

اور شان و شوکت اور عیش پرستی کے ضمن میں دارا کا نام لیا جاتا ہے۔

تلمیح ۸۶ : لیلیٰ ؏

ہر دختر ہمسرِ لیلیٰ ہے

(نظم "ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے" کا اٹھارواں مصرعہ، ص ۱۱)

لیلیٰ کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۱۵

تلمیح ۸۷ : فلسطین۔

(نظم ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کیلئے" ص ۱۲)

فلسطین کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۵

تلمیح ۸۸ : کوہ ندا ۔

آوارہ ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرت ہے کہ طولِ شب غم ہے

(غزل کا پہلا شعر، ص ۱۷)

کوہِ ندا کیلئے دیکھئے تلمیح نمبر ۴۹

تلمیح ۸۹ : جم ۔

جس نور سے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے

(غزل کا تیسرا شعر، ص ۱۷)

جم کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۱۷

تلمیح ۹۰ : حسرتؔ موہانی ۔

(غزل، نذر مولانا حسرت موہانی، ص ۲۰)

سید فضل الحسن حسرت ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ شروع شروع میں حسرتؔ زیادہ تر علمی وادبی خدمات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ تاہم ملک کے حالات ایسے تھے کہ وہ سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے اور تحریکِ آزادی کے فعال رکن بن گئے۔ اپنی سیاسی وصحافتی مصروفیات کے باوجود حسرت نے اردو غزل کی مشاطگی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی سبب غزل گوئی میں حسرت کا مرتبہ نہایت بلند اور امتیازی ہے۔

حسرتؔ، تسلیم لکھنویؔ کے شاگرد تھے جنہیں نسیم دہلوی سے تلمذ تھا۔ حسرتؔ کا کلام نہ تو سراسر یاس وناامیدی کا مرقع ہے نہ صرف عیش ونشاط کا صحیفہ بلکہ ہر دو طرح کے جذبات واحساسات کا مجموعہ۔ وہ فطری طور پر زاہدِ خشک نہیں تھے اسی لئے ان کے کلام میں رنگینی ملتی ہے لیکن بعض جگہ شوخی متانت کے دائرے سے تجاوز کر گئی ہے۔ حسرت ان چند مخصوص شعراء میں سے ایک ہیں جو غزل میں تغزل کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

حسرتؔ ایک طرف مقتدر سیاستداں تھے تو دوسری طرف ایک اچھے شاعر اور بالغ نظر نقاد۔ وہ اپنے عہد کی دونوں اہم سیاسی جماعتوں، کانگریس اور مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ ایک کٹر قوم پرست ہونے کی بناء پر انھوں نے برطانوی سامراج کی پرزور مخالفت کی اور اس کے لئے کئی مرتبہ جیل خانہ کی صعوبتیں جھیلیں۔ فیضؔ نے اپنی مسلسل غزل میں حسرتؔ کے اسی وصف کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ حسرتؔ کا انتقال ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو لکھنو میں ہوا۔

تلمیح ۹۱: ذوقؔ

نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے

غزل (ص ۲۱) کا تیسرا شعر جس کا مصرعہ ثانی ذوقؔ کی غزل کے مشہور مطلع کے مصرعہ اولی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ ذوقؔ کا مطلع ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں حافظ غلام رسول سے تعلیم حاصل کی۔ غلام رسول خود بھی شاعر تھے اور ان کی صحبت میں ذوقؔ بھی شعر گوئی کی طرف مائل

ہوئے۔ اس زمانے میں دہلی کے ادبی حلقوں میں شاہ نصیر کی شاعری کی دھوم تھی۔ ذوقؔ، نصیر کے شاگرد ہو گئے اور بہت جلد بحیثیتِ شاعر مشہور ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ نصیر نے ذوقؔ کی بڑھتی ہوئی شہرت کے پیشِ نظر انہیں اپنے حلقہ تلامذہ سے خارج کر دیا تھا جس کے بعد ذوقؔ نے خود اپنی قابلیت اور ریاضت کے برتے پر اپنی شاعری کا سکہ جمایا۔ ان دنوں بہادر شاہ ظفر ولی عہد سلطنت تھے۔ انہوں نے بیس سالہ ذوقؔ کو اپنا استاد مقرر کیا اور انھیں خاقانیٔ ہند کے خطاب سے نوازا۔ ظفرؔ کی تخت نشینی کے بعد ذوقؔ ملک الشعراء مقرر ہوئے، انھیں جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ تادمِ حیات اس منصب پر فائز رہے۔

چونکہ ذوقؔ عہد جوانی سے لے کر وفات تک دربار سے وابستہ رہے اسلئے ان کا کلام زیادہ تر قصائد پر مشتمل ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن صنفِ قصیدہ پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ اکثر ناقدین ادب انھیں سودا کے بعد سب سے بڑا قصیدہ نگار مانتے ہیں۔ ذوقؔ کی غزلیں بھی چند خصوصیات کی حامل ہیں۔ زبان کی سادگی اور ان کے مزاج کی نرمی نے ان کی غزلوں کو برجستہ بنا دیا ہے لیکن جذبہ کی کمی سے تغزل کم ہو گیا ہے۔

ذوقؔ بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص تھے۔ گھنٹوں عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے سبب ان کے کلام میں واعظانہ اور ناصحانہ قسم کے اشعار کی کثرت ہے۔ زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی اور یہی وصف ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ذوقؔ کا زیادہ تر کلام غدر کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا۔ ان کے شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے دوسرے شاگردوں مثلاً حافظ ویراں، انورؔ اور ظہیر دہلوی کی مدد سے ایک مختصر دیوان مرتب کر کے شائع کیا جس میں غزل کے بارہ سو اشعار اور پندرہ قصائد شامل ہیں۔ ذوقؔ کی وفات ۱۸۵۴ء میں دہلی میں ہوئی۔

تلمیح ۹۲ : ناظمِ حکمت

فیضؔ نے ص ۲۷ پر "ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار" عنوان قائم کر کے تین مختصر نظمیں شائع کی ہیں۔ ناظم حکمت کے سلسلے میں دیکھئے تلمیح نمبر ۶۷

تلمیح ۹۳ : شبیرؓ

بیتِ شبیر پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے

(نظم "شام غربت" کا پانچواں مصرعہ، ص ۳۵)

حضرت امام حسینؓ کے لئے دیکھئے تلمیحات نمبر ۶۲ اور ۶۵ .... ختم شد

TALMEEHAT-E-FAIZ

By Zaheer Ali

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی

پروفیسر ظہیر علی

پروفیسر ظہیر علی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، وہ شاع
بھی ہیں اور نثار بھی، ڈرامہ نگار بھی ہیں اور صحافی بھی۔ اردو اور انگریز
پر یکساں قدرت رکھنے کی وجہ سے ان کے اردو اور انگریزی ترا
شان رکھتے ہیں۔

پروفیسر ظہیر علی نے ۱۶؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اورنگ آباد میں
کھولیں۔ اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ
آپ نے پولیٹیکل سائنس میں گریجویشن کیا اور پھر اسی
مراٹھواڑہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ آپ کی سب سے پہ
دہلی کے ایک رسالے میں سب ایڈیٹری تھی لیکن جلد ہی درس و
سے وابستہ ہوگئے۔ آج کل وہ ممبئی کے ایک کالج میں پولیٹیکل سائنس
کے استاد ہیں۔ پروفیسر موصوف برصغیر کے اردو اور انگریزی رسائل میں
باقاعدگی سے لکھتے رہتے ہیں اور ان کی تحریروں کو وقعت کی نگا ... کھا
جاتا ہے۔

آپ نے صابر دت کی معیت میں "فن اور شخصیت" نامی مشہور ر
کی ادارتی فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ آپ نے ... جیو
کی انگریزی کتاب "ورنداون لال ورما" کا اردو ترجمہ کیا
ساہتیہ اکادیمی دہلی نے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں ان کی کتاب
"Off the Spotlight" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مستقبل
قریب میں آپ کی دو کتابیں "پابجولاں" (شاعری) اور "تماشا کہیں
جسے" (ڈرامے) منظر عام پر آنے والی ہیں۔ اسی طرح آپ
نے ڈاکٹر آدم شیخ کی تحریر کردہ سوانحی تخلیق "ڈاکٹر محمد اسحٰق
جمخانہ والا۔ شخصیت اور خدمات" کا بھی انگریزی میں ترجمہ بعنوان
"Portrait of A Pragmatic" کیا ہے جو عنقریب شائع
ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر آدم شیخ

Published by:
ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, D. N. Road, Opp. C.S. Terminus
Bori Bunder, Mumbai 400 001